ماہنامہ مجلہ

حیات نو

بلریا گنج

کی خصوصی پیش کش

قائد تحریک اسلامی ہند

مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی

رحمۃ اللہ علیہ

وہ ہند میں سرمایہ ملت کا نگہبان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

ماہنامہ مجلّہ

حیاتِ نو

بلریاگنج

کی خصوصی پیشکش

(بیاد مولانا ابواللیث اصلاحی ندویؒ)

قائد تحریک اسلامی ہند

جلد ۶ — شمارہ ۲ تا ۶

فروری تا جون سنہ ۱۹۹۱ء

بدل اشتراک

سالانہ زرتعاون	۴۰ روپے
خصوصی تعاون	۱۰۰ روپے
غیر ممالک	۲۰ امریکی ڈالر
قیمت فی شمارہ	۴ روپے
اس شمارے کی قیمت	۱۵ روپے

مدیر مسئول

نور محمد فلاحی

معاون

محمد اسمٰعیل فلاحی

مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

ترسیل زر کا پتہ

دفتر ماہنامہ مجلّہ "حیات نو" جامعۃ الفلاح، بلریاگنج، اعظم گڑھ یوپی ۲۷۶۱۲۱

"نشاط آفسیٹ پریس ٹانڈہ"

نقوشِ حیاتِ نو

		صفحہ نمبر
اداریہ		
چند گزارشات	محمد اسمٰعیل فلاحی	۴
مقالات		
وہ کتنے عظیم انسان تھے	محمد عنایت اللہ سبحانی	۸
زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو	مولانا محمد شہباز اصلاحی	۱۳
قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کا نمونہ	ڈاکٹر احمد سجاد	۱۷
مولانا ابواللیث صاحب اپنے ماتحتوں کے درمیان	عبدالحق فلاحی	۳۵
مولانا ابواللیث صاحب، جماعت اسلامی اور ملتِ اسلامیہ	ڈاکٹر عبدالمغنی	۵۰
مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی کی علمی خدمات	عبدالصبر اثری فلاحی	۵۵
مولانا ابواللیث ندوی داماد کی نظر میں	محمد شعیب ندوی	۶۶
حضرت مولانا ابواللیث صاحب، چند یادیں	عبدالعلیم اصلاحی	۶۹
مولانا ابواللیث صاحب بیٹی کی نظر میں	ساجدہ ہلالی	۷۲
آہ! مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی	ابوسفیان اصلاحی	۷۵
مولانا ابواللیث کی شخصیت کے چند پہلو	سید یوسف دہلی	۸۲
عظیم انسان عظیم باتیں	صاحبزادہ عبدالعظیم خاں صاحب	۹۴
مولانا کا نام نامی	محمد عنایت اللہ سبحانی	۱۰۱
مولانا کی نمایاں خصوصیات	نظام الدین اصلاحی	۱۰۷
تاثرات واحساسات		
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے	سلامت اللہ اصلاحی	۱۱۰
مولانا مرحوم کی زندگی کی دو باتیں	جاوید سلطان اعظمی	۱۱۶

		صفحہ نمبر
قند مکرر		
ابواللیث بے لوث	نعیم صدیقی	۱۲۰
آہ! مولانا ابواللیث صاحب	ضیاء الدین اصلاحی	۱۲۲
وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہباں	محمد اسمٰعیل فلاحی	۱۲۵
آہ! مولانا ابواللیث ندوی	مولانا مجیب اللہ ندوی	۱۳۲
عالم اسلام کا بطلِ جلیل	سہ روزہ دعوت نئی دہلی	۱۳۵
مولانا ابواللیث مرحوم کا ایک خطاب	محمد اسمٰعیل فلاحی	۱۳۷
مولانا ابواللیث اصلاحی سے لیا گیا ایک انٹرویو		۱۴۱
انٹرویو		
باپ کا پیار بھی دیا ماں کی ممتا بھی	صالحہ تبسم	۷۹
نگہ بلند سخن دلنواز	ابوبکر اصلاحی	۹۰
کیا اور کوئی بھائی ہوگا جو اپنی بہن کو اتنا عزیز رکھتا ہو	ختم النساء صاحبہ	۱۰۴
شعر و نغمہ		
ہے بوریا اداس کہ سلطاں چلا گیا	حکیم محمد ایوب	۵۴
گلشن کی روحِ جانِ بہاراں چلا گیا	عمران اعظمی	۱۰۳
اعتبار بھی ہے تو کیسی اعتبار یہ اے خدا	کوثر اعظمی	۱۱۸
جامعہ کے لیل و نہار	محمد اسمٰعیل فلاحی	۱۴۴
انتظامیہ کا اجلاس اور بعض اہم تبدیلیاں		
وفیات		
سارا چمن اداس ہے مالی کہاں گیا	محمد عنایت اللہ سبحانی	۱۴۶

❋❋❋❋❋

اداریہ

محمد اسمٰعیل فلاحی

چند گذارشات

مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی مرحوم کی حیات وخدمات پر "قائد تحریک اسلامی ہند" نمبر پیش کرتے ہوئے ادارہ حیات نو کو مسرت اور خوشی ہے۔ ادارہ اسے اپنی سعادت سمجھتا ہے۔ مولانا مرحوم کوئی فرشتہ یا معصوم صفت انسان نہیں تھے کہ ان سے اختلاف نہ کیا جا سکتا ہو، تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ تاریخ کے اس طویل سفر میں اللہ تعالیٰ کی معیت ان کے شامل حال رہی اور یہ واقعہ ہے کہ مولانا کی شخصیت کو تحریک اسلامی ہند کی تاریخ سے بلکہ ملت اسلامیہ کی تاریخ سے، بلکہ پورے ملک کی تاریخ سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ مولانا نے تحریک اسلامی ، ملت اسلامیہ ہند اور اس پورے ملک کو بہت کچھ دیا ہے۔

ادارہ کو اس بات کا بھی شدت سے احساس ہے کہ ایسی وقیع شخصیت کو سامنے لانے کے لئے جس محنت، لگن اور عرق ریزی کی ضرورت تھی، اس میں بوجوہ کمی رہی۔ پھر بھی جو کچھ اس موضوع پر ہم اکٹھا کر سکے وہ نذر قارئین ہے۔ ضرورت ہے کہ اس پر مزید کام کیا جائے۔ ابھی بہت سے پہلو تشنہ ہیں اور مولانا مرحوم کا ہم پر حق ہے اور اسلام، ملت اسلامیہ ہند، اور تحریک اسلامی سب کے مفاد کا تقاضا ہے کہ ان پہلوؤں کو اجاگر کیا جائے۔

جب کوئی ملت زوال کی طرف لڑھکنے لگتی ہے تو قصیدہ خوانی اس کا شیوہ بن جاتا ہے اور وہ اپنے بزرگوں کی شان میں قصیدے کہتی، قصیدے سنتی اور قصیدے پڑھتی اور اس پر سر دھنتی ہے۔ خود عمل کرنا اور اپنی دنیا آپ بنانے کا اس کے اندر حوصلہ اور داعیہ نہیں پیدا ہوتا۔ پدرم سلطان بود کا نعرہ ہی اس کی زندگی اور اس کی غذا ہوتا ہے۔ اس بات کا احساس نہیں ہوتا کہ باپ تو سلطان تھا لیکن ہم غلام اور پیروں کی ٹھوکر ہیں۔ سلطانیٔ پدر کا یہ غرور و نشہ شراب کے نشہ سے زیادہ تیز ہوتا ہے جو عقل و دماغ ہی کو معطل اور بیکار نہیں کرتا، ایک ایک حس کو ختم کر ڈالتا ہے۔ زوال پذیر قومیں ہمیشہ اسی نشہ میں بدمست ہوتی ہیں۔ جوں جوں

زوال بڑھتا ہے یہ نشہ تیز سے تیز تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ آباء و اجداد کیا تھے وہ کردار کی کس بلندی پر فائز تھے، آب زر سے لکھے جانے کے لائق ان کے کیا کارنامے تھے، اور ہم کیا ہیں، کردار کس منزل میں ہیں اور ہمارے "کارنامے" کیا ہیں، اس طرف نظر نہیں جاتی۔

اس کے برعکس زندہ قوموں کے اقبال مند نوجوان اپنی راہ آپ نکالتے اور اپنی دنیا آپ پیدا کرتے ہیں۔ قصیدہ خوانی کی محفلیں سجانے کے بجائے انھیں عمل سے پیار ہوتا ہے۔ عمل سے ان کی زندگی عبارت ہوتی ہے، وہ کردار کے غازی اور مرد میدان ہوتے ہیں، وہ کردار و عمل اور ترقی و عروج کی ان چوٹیوں کو خود سر کرنا چاہتے ہیں جو ان کے آباء و اجداد نے کی ہیں بلکہ ان سے آگے بڑھنا اور ان سے بازی لے جانا چاہتے ہیں۔ انھیں بزرگوں کی کہانیاں سننے سنانے میں زیادہ مزہ نہیں آتا۔ وہ یہ نعرہ نہیں لگاتے کہ ہمارے آباء و اجداد ایسے اور ایسے تھے بلکہ ان کی خودی، طبیعت کی بلندی اور فولادی قوتِ ارادی انھیں عمل پر ابھارتی اور وہ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں دیکھو ہم یہ ہیں۔

لیس الفتی من یقول کان ابی — ان الفتی من یقول ھا انا ذا

(بہادر جوان وہ نہیں ہے جو یہ کہتا ہو کہ میرا باپ ایسا تھا۔ جوان تو وہ ہے جو یہ کہے یہ میں ہوں مجھے دیکھو)

یہ دو کردار ہیں، آگے بڑھنے سے پہلے ہم اپنا جائزہ لے لیں۔ اگر اپنے اندر اس دوسری قسم کے شاہین صفت نوجوانوں کا کچھ حوصلہ پاتے ہوں تو اس مجلۂ خاص کا مطالعہ کریں ورنہ اسے بند کر کے رکھ دینا زیادہ بہتر ہے۔

ہمیں دکھ ہے کہ ہمارے معزز قارئین کو اس دفعہ حیات نو کے تازہ شمارہ کے لئے انتہائی صبر آزما انتظار سے گذرنا پڑا۔ ہم معذرت کے لئے کہاں سے الفاظ لائیں اور اپنی روداد غم اور اپنا دکھڑا کیسے سنائیں ؎

بہت دشوار ہے جتنا سمجھنا اتنا سمجھانا

واقعہ یہ ہے کہ کوہ کنی تو آسان ہے لیکن اس دور میں کوئی اردو رسالہ یا اخبار نکالنا دشوار تر ہے۔ اس کے لئے شیر کے دل اور شاہین کے جگر سے بھی بڑھ کر کچھ چاہئے۔ خصوصاً ایسے

حالات میں جب کہ وسائل بڑی حد تک معدوم ہوں اور رسالہ بھی اسلامی فکر کا حامل اور تحقیقی انداز کا ہو۔ یہ حالات کی ستم ظریفی ہی تو ہے کہ حیات نو جیسے موقر رسالہ کے لئے کوئی فارغ ایڈیٹر نہیں ہے (راقم کے ذمہ اصلاً تدریسی خدمات ہیں) اور کوئی منیجر بھی نہیں۔ کتابت کا حال یہ ہے کہ ہمارے سابق کاتب رفیق احمد صاحب کے کتابت چھوڑ دینے کے بعد، تلاش بسیار کے باوجود کوئی مستقل کاتب نہیں مل سکا۔ مختلف مقامات پر دسیوں کاتب کے پاس دوڑنا پڑا اور ادھر چند مہینے سے جن صاحب سے کتابت کا کام لیا جا رہا تھا انہوں نے مہینوں دوڑانے کے بعد رمضان کے قریب جبکہ لمبی چھٹیاں ہونے والی تھیں، اچانک یہ کہہ کر کتابت سے انکار کر دیا کہ فی صفحہ اتنا اضافہ کیا جائے ورنہ ہم کام سے معذور ہیں اور مہینوں کا پڑا ہوا مواد واپس کر دیا۔ عید بعد مجبوراً نمائندہ کو رخ کرنا پڑا۔ نمائندہ آنے جانے میں پورا دن لگ جاتا ہے اور پھر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ پہونچنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ کاتب کہیں گئے ہوئے ہیں اور بے نیل مرام واپسی ہوتی ہے۔

جسے سردرد نہ ہوا ہو، وہ اس کی شدت کو نہیں جان سکتا۔ اسی طرح میری یہ باتیں شاید ان لوگوں کے حلق سے نیچے نہ اتریں جو سردرد کی حلاوت سے محروم اور لذت نا آشنا رہے ہوں۔ وہ یہ کہہ سکتے ہیں کتابت وطباعت کیا بلا ہے اور ادارت ومنیجری کون سا مسئلہ ہے؟ میں جواب میں یہ کہوں گا اللہ آپ کو سردرد سے محروم رکھے، بھلے آپ سردرد نہ سمجھیں،

سردرد بڑی بری بلا ہے، سر پھٹ جاتا ہے۔

بعض ناگزیر اسباب کی بنا پر یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ عارضی طور پر حیات نو کے صفحات میں کمی کر کے اسے ۴۰ صفحات پر مشتمل نکالا جائے۔ اس لئے اس شمارہ کے بعد سے یہ ۴۸ صفحات پر مشتمل نکلا کرے گا۔

مدرسۃ الاصلاح سرائمیر کے صدر مدرس جناب مولانا عبدالمجید صاحب اصلاحی ندوی مرحوم و مغفور کا اس طرح ہمارے درمیان سے اٹھ جانا صرف مدرسۃ الاصلاح سرائمیر اور اصلاحی و ندوی،

برادری کے لئے ہی نہیں، ہم سب کے لئے بڑا جانکاہ حادثہ ہے۔ خصوصاً میرے لئے تو یہ غم دو چند ہے۔ ان سے میری ملاقات گرچہ پرانی نہیں تھی لیکن مختصر سے عرصہ میں انھوں نے جو شفقت اور محبت دی وہ بھلائے نہیں بھولتی۔

وہ ایک مضبوط سیرت وکردار کے مالک تھے، علاقہ کے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں پر ان کے گہرے اثرات تھے اور دونوں ہی ان کو اپنا بڑا مانتے تھے۔ وہ صرف مولوی ہی نہیں تھے بلکہ مرد میدان بھی تھے۔ ان سے لوہا لینا آسان نہیں تھا۔ شرپسند عناصر ان سے دبتے تھے۔ کتنے ڈاکوؤں نے ان کے ہاتھ پر توبہ کی ہے۔ مدرسۃ الاصلاح کو جن حالات میں انھوں نے سنبھالا وہ انھیں کا حصہ ہے۔

جب کسی ملک کے عوام کا مزاج بگڑتا ہے تو وہاں یہی کچھ ہوتا ہے، کسی کی جان ومال اور عزت وآبرو محفوظ نہیں رہتی۔ راجیو گاندھی کا بہیمانہ و بزدلانہ قتل اسی کی مثال ہے۔ اور اس کے دوسرے دن ہی مولانا مرحوم کا یہ حادثہ اس کا واضح نمونہ ہے۔ مولانا مرحوم مولانا عبدالحبیب صاحب اصلاحی کے گھر ان کی بچی کی تقریب میں شرکت کے لئے آئے تھے کہ سرائے رانی میں اچانک شرپسندوں کے وحشیانہ حملہ کا نشانہ بن گئے۔

اللہ سے دعا ہے کہ مرحوم کی مغفرت فرمائے۔ پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق دے اور اس خلا کو پر کرنے کا غیب سے سامان فرمائے۔

(بقیہ: قرون اولیٰ) ......

کمزور صحت اور ناسازگار حالات کے باوجود مسلسل سفر کرتے رہے۔ دوران سفر دیہاتی مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھرڈ کلاس ریلوے بوگی میں انہیں اگر دھکے کھاتے ہوئے دیکھا گیا تو تبلیغی اجتماعات کے موقعوں پر خشیت الٰہی کے زیر اثر آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی بھی دیکھی گئی۔ چنانچہ میر کارواں کی اسی نگاہ بلند، سخن دلنواز اور جاں پرسوز سے متاثر ہو کر ممتاز محقق اور عالم دین مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے ہندستان کے صدر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے ایک موقع پر بے ساختہ کہا تھا کہ کسی کو قرون اولیٰ کے مسلمانوں کا نمونہ دیکھنا ہو تو وہ مولانا ابواللیث اصلاحی کو دیکھ لے۔

(تعمیر کراچی، صفحہ ۶، ۲۰ دسمبر [illegible])

باسمہ تعالیٰ

محمد عنایت اللہ سبحانی

وہ کتنے عظیم انسان تھے!

استاذی و مرشدی حضرت مولانا ابواللیث صاحب رحمۃ اللہ علیہ کتنے عظیم انسان تھے

آہ! وہ کتنے عظیم انسان نظر آتے تھے اس وقت جبکہ ہندوستان گیر اسلامی تحریک کے ہر دل عزیز قائد و رہنما ہوتے ہوئے بھی صبح کو رات کی بچی ہوئی باسی روٹی کا ناشتہ کر لیا کرتے تھے۔

جناب محمد مسلم صاحب مرحوم سابق ایڈیٹر "دعوت" اس بات کا انکشاف کرتے ہوئے کہ وہ جماعت اسلامی سے کس طرح قریب ہوئے فرماتے ہیں:-

"مجھے مولانا (ابواللیث صاحب) سے کچھ مشورہ کرکے فوراً بھوپال واپس ہونا تھا۔ میں اسٹیشن سے سیدھا مرکز جماعت پہنچا۔ یہ صبح کا وقت تھا۔ مولانا ناشتے کے لئے دسترخوان پر بیٹھ چکے تھے۔ میں نے گھر میں اطلاع کرائی تو وہیں بلالیا۔ فرمایا: آیئے، آیئے، ناشتہ کیجئے۔

میں نے دیکھا دسترخوان پر باسی روٹیاں اور ترکاری تھی۔ مولانا صبر و شکر کی تصویر بنے ہوئے ان باسی روٹیوں کا ناشتہ فرما رہے تھے۔ ہم نے یہ ناشتہ کیا۔ پھر چائے پی۔ دل نے کہا: یہ دسترخوان تو بایزید بسطامی کے دسترخوان پر بھی فوقیت لے گیا۔ اور یہی باسی روٹیاں کھاکر میں تحریک اسلامی کی طرف کشاں کشاں بڑھنے لگا۔ یہاں تک کہ اس میں شامل ہو گیا۔"

آہ! وہ کتنے عظیم انسان نظر آتے تھے اس وقت جبکہ وہ رام پور کے دوران قیام میں بارہا خالی شروانی پہنے ہوئے نظر آئے۔ اس کے نیچے نہ قمیص ہوتی نہ بنیائن۔ اور سراغ لگانے پر معلوم ہوا کہ مولانا کے پاس ایک ہی جوڑ کپڑے ہیں۔ اور وہ انہوں نے اتار دیے ہیں دھلنے کیلئے!

مولانا نورالدین صاحب نظامی سابق پرنسپل مدرسہ عالیہ۔ رام پور کی روایت ہے کہ انہیں ایک بار دہلی جانا تھا۔ دہلی میں جس جگہ جانا تھا، اس جگہ کا نام تو یاد تھا لیکن پتہ یاد نہ رہا۔ وہ اسی سلسلے میں فکرمند تھے کہ اچانک مولانا ابواللیث صاحب نظر آگئے۔ سلام کے بعد مولانا نے پوچھا

ارے بھئی خیریت ہے؟ کس سوچ میں غرق ہیں آپ؟ انہوں نے اپنی پریشانی کا ذکر کیا۔ فرمایا: فکر نہ کیجئے۔ مجھے بھی وہیں جانا ہے۔ آئیے ساتھ چلیں گے۔ چنانچہ وہ مولانا کے ساتھ ہو لئے۔ مولانا انہیں اپنی رہائش گاہ پر لے گئے۔

نظامی صاحب کا کہنا ہے کہ وہاں ایک کرتہ الگنی پر پھیلا ہوا تھا۔ مولانا نے شیروانی اتار کر اس کرتے کو پہننا چاہا، لیکن پھر چھوڑ دیا۔ اس لئے کہ وہ کرتہ ابھی سوکھا نہیں تھا۔

پھر نظامی صاحب نے آبدیدہ ہو کر فرمایا: اس وقت مولانا کے پاس وہی ایک کرتا تھا!

آہ! وہ کتنے عظیم نظر آتے تھے اس وقت جب کہ وہ دعائے نیم شبی اور آہ سحرگاہی میں مصروف ہوتے، دہلی کے دوران قیام میں وہ اذان فجر سے پہلے اٹھ کر نماز تہجد ادا کرتے۔ اور پھر کبھی تو وہ اذان سے پہلے ہی دفتر "دعوت" پہنچ جاتے تاکہ روزنامہ "دعوت" میں کام کرنے والے ملازمین کو نماز کے لئے جگا دیں۔ اور کبھی نماز سے فارغ ہو کر سیدھے دفتر "دعوت" کا رخ کرتے یہ جائزہ لینے کے لئے کہ کن کن لوگوں نے نماز باجماعت ادا کی ہے۔ اور کون لوگ پیچھے رہ گئے حالانکہ جن لوگوں نے دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ مرکز جماعت اور دفتر "دعوت" میں خاصا فاصلہ ہے۔

آہ! وہ کتنے عظیم نظر آتے تھے اس وقت جب کہ وہ ملت اسلامیہ کے درد میں گھل رہے ہوتے تھے۔ اور مختلف جماعتوں کے ذمہ داروں سے یہ آرزو لئے ہوئے ملاقاتیں کر رہے ہوتے تھے کہ ان کے درمیان اتحاد و تعاون کی کوئی راہ نکل آئے۔ لیکن کہیں سے انہیں کوئی امید افزا جواب نہیں مل سکا۔

ذاتی طور پر ہمیں یہ معلوم ہے کہ مولانا کئی بار اسی غرض سے بستی نظام الدین دہلی تشریف لے گئے، تبلیغی جماعت کے امیر کے پاس، لیکن ادھر صورت حال یہ رہی کہ وہ مولانا کی طرف متوجہ نہ ہوئے۔ انہوں نے سرے سے موقع ہی نہیں دیا کہ مولانا ان سے اس موضوع پر گفتگو کر سکیں۔

آہ! وہ کتنے عظیم نظر آرہے تھے اس وقت جب کہ وہ دہلی میں بیٹھے ہوئے تحریک اسلامی کی رگوں میں اپنا خون جگر نچوڑ رہے تھے۔ اور یہاں آبائی وطن موضع چاند پٹی میں ان کا اپنا گھر— مٹی کا کچا گھر... برسات کی موسلا دھار بارش کی تاب نہ لاکر گرنا شروع ہو گیا تھا۔ اس کی ایک دیوار بالکل زمین بوس ہو گئی تھی۔ پھر مولانا کے اہل خاندان نے ان کے وطن تشریف لانے سے پہلے ہی

وہ دیوار کھڑی کردی۔ لیکن غلطی سے وہ ایک آدھ اِنچ پڑوسی کی زمین پر آگئی۔

مولانا جب چاندپٹی تشریف لائے اور انہوں نے یہ محسوس کیا یا انھیں یہ معلوم ہوا کہ دیوار ایک آدھ انچ آگے ہوگئی ہے تو اسی وقت اس دیوار کو گرا کر اپنی جگہ پر لانے کا حکم دیا۔

آہ! وہ کتنے عظیم نظر آتے تھے اس وقت جبکہ بہت سے لوگ اُن کے ساتھ زیادتیاں اور گستاخیاں کرتے تھے۔ اُنہیں اذیت پہنچانے اور ان کا دل دکھانے کے لئے اوچھی حرکتیں کرتے تھے لیکن اس وقت بھی مولانا عفت و شرافت کا پیکر نظر آتے تھے۔

اس طرح کے کتنے ہی مناظر ہم نے بھی دیکھے ہیں اور نہ جانے کتنے لوگوں نے دیکھے ہیں چنانچہ وہ منظر اس وقت ہماری آنکھوں میں ہے جبکہ مولانا پہلی بار اپنی خرابی صحت کی وجہ سے جماعت کی امارت سے مستعفی ہو کر اپنے وطن چاندپٹی آگئے تھے۔ اس وقت جامعۃ الفلاح کے ارباب حل و عقد نے اصرار کرکے مولانا کو جامعۃ الفلاح کا ناظم اعلیٰ بنا دیا تھا۔ اسی زمانے میں یہ دردناک منظر بھی سامنے آیا کہ علاقے کے کچھ لوگوں نے یہ اڑا دیا کہ مولانا اس مدرسہ سے تنخواہ تو پابندی سے وصول کرتے ہیں لیکن مدرسہ کو وقت بہت کم دیتے ہیں۔ وقت کا زیادہ حصّہ اپنے گاؤں میں گزارتے ہیں۔

شدہ شدہ یہ بات مولانا کے کانوں تک پہنچ گئی۔ اس وقت اس پیکرِ اخلاص کے دل نازک پہ کیا بیتی ہوگی۔ اس کا اندازہ کون کرسکتا ہے!

بہرکیف مولانا نے ہاتھ میں چھڑی لی۔ اور بازار کی طرف روانہ ہوگئے۔ راقم الحروف بھی مولانا کے ساتھ ساتھ تھا۔ اس وقت باری باری کئی آدمیوں کے پاس گئے۔ اور نہایت نرم و سنجیدہ لہجے میں فرمایا:۔

"ارے بھئی! تم سے کس نے کہہ دیا کہ میں جامعۃ الفلاح سے تنخواہ لیتا ہوں۔ میں تو مدرسہ کی جو بھی خدمت کر رہا ہوں، محض آخرت کے لئے کر رہا ہوں"

اور قبل اس کے کہ وہ شخص کوئی معذرت کرے، نہایت بے نیازی کے ساتھ وہاں سے یہ دو جملے کہہ کر روانہ ہوگئے۔

آہ! وہ کتنے عظیم نظر آتے تھے اس وقت جب کہ اتنی ساری ذمہ داریوں سے گراں بار ہونے کے باوجود وہ ہر عزیز، ہر قریب، ہر رفیق، ہر ساتھی اور ہر پڑوسی کا پورا پورا خیال رکھتے تھے اور

کسی کی ذرا بھی حق تلفی نہیں ہونے دیتے تھے۔ آہ!

مولانا کے اہل خاندان کا ان کے بارے میں یہ تاثر کتنی اہمیت رکھتا ہے کہ مولانا نے حتی المقدور ہر ایک کو اپنا ممنون کرم اور اپنا احسانمند بنایا، اور نہ جانے کتنوں کو ان کی ذات سے فیض پہنچا، لیکن خود وہ کبھی کسی کا احسان اُٹھانے کے لئے تیار نہ ہوئے۔

اس ضمن میں مولانا کا وہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے جو رام پور کے ایک بزرگ کے واسطے سے ہم تک پہنچا ہے۔ اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ برسوں پہلے مولانا کا ایک چھوٹا بچہ اچانک ایک حادثہ کی زد میں آگیا۔ اس کی پنڈلی کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ ان بزرگ کی روایت ہے کہ میں نے اپنے ایک دوست سے کہا کہ مولانا کفاف پر گزارا کرتے ہیں۔ ان کے پاس علاج کے لئے پیسے کہاں ہوں گے۔ آؤ ہم دونوں مل کر مولانا کی کچھ مدد کریں۔ تاکہ بچے کا صحیح طور سے علاج تو ہو سکے۔

چنانچہ ہم دونوں مولانا کے گھر پہنچے۔ اور اظہار ہمدردی کرتے ہوئے دو ہزار کی رقم پیش کی مولانا نے پہلے تو اس پر ہمارا شکریہ ادا کیا، پھر فرمایا، اس رقم کی ضرورت نہیں ہے۔ جماعت خود بچے کا علاج کرا رہی ہے۔ اس کے بعد بھی ہم دونوں نے بہت اصرار کیا کہ مولانا کسی طرح اس رقم کو قبول فرمالیں لیکن مولانا نے نہایت بے نیازی کا ثبوت دیا۔ وہ کوئی بھی رقم لینے کے لئے تیار نہ ہوئے۔

آہ! وہ کتنے عظیم نظر آتے تھے اس وقت جب کہ دنیا بار بار ان کی طرف بڑھی۔ انہیں اپنی طرف مائل کرنے کے لئے، لیکن ہر بار انھوں نے نہایت بے نیازی کے ساتھ اسے ٹھوکر مار دی اور اس کی طرف ایک نگاہ غلط انداز بھی ڈالنے کے روادار نہ ہوئے۔

آہ! وہ کتنے عظیم نظر آتے تھے اس وقت جبکہ وہ قید و بند کی آزمائشوں سے دوچار ہوئے اور بار بار انہیں جیل کی صعوبتیں جھیلنی پڑیں۔ لیکن ان کے عزم و حوصلے میں کوئی کمزوری نہیں آئی اور جتنے بھی ناساعد حالات ہوں، کبھی وہ خوف اور گھبراہٹ کی حالت میں نہیں دیکھے گئے۔ اس کے برعکس وہ ہمیشہ اپنے ساتھیوں کے لئے صبر و استقامت اور جرأت و عزیمت کا ایک بہترین نمونہ ثابت ہوئے۔

کتنی ساری عظمتیں جمع ہو گئی تھیں ہمارے اس مرحوم رہنما میں!

مگر یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ کیونکہ وہ ترجمان القرآن امام حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت کیمیا اثر سے فیضیاب ہوئے تھے۔ انہوں نے ایک لمبے عرصہ تک امام فراہیؒ کی خدمت

● مولانا محمد شہباز صاحب اصلاحی
استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء

زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو

امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں کتاب الجنائز کے باب ثناء الناس علی المیت کے تحت حضرت انس بن مالکؓ کے واسطے سے ایک حدیث نقل کی ہے۔

مروا بجنازة فاثنوا عليها
خيرا فقال النبي صلى الله
عليه وسلم وجبت ثم مروا
بالاخرى فاثنوا عليها شرا
فقال النبي صلى الله عليه
وسلم وجبت فقال عمر بن
الخطاب ما وجبت قال هذا
اثنيتم عليه خيرا فوجبت
له الجنة وهذا اثنيتم عليه
شرا فوجبت له النار انتم
شهداء الله في الارض۔

ایک جنازہ گزرا اور لوگوں نے میت کی
خوبیاں بیان کیں تو حضور صلی اللہ علیہ
وسلم نے فرمایا واجب ہوگئی۔ پھر دوسرا
جنازہ گزرا اور لوگوں نے میت کی خرابیاں
بیان کیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم
نے فرمایا واجب ہوگئی۔ حضرت عمرؓ
نے عرض کیا کیا چیز واجب ہوگئی۔ تو
آپ نے فرمایا پہلی میت کی تم نے خوبیاں
بیان کیں تو اس کے لئے جنت واجب
ہوگئی اور دوسری کی خرابیاں بیان کیں
تو اس کے لئے دوزخ واجب ہوگئی۔ تم
لوگ زمین میں اللہ کے گواہ ہو۔

حضرت مولانا ابواللیث صاحب اصلاحی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد بھی گفتگو یا تعزیتی نشستوں اور اخباری بیانوں میں مختلف فکر اور مزاج کے لوگوں کے تاثرات

کی تھی۔ اور اس خدمت کے دوران تقویٰ وطہارت، امانت و دیانت، نیکی و شرافت، اخلاص ومحبت، بے نفسی وللہیت، خوف خدا اور فکر آخرت کے جو ایمان افروز اور روح پرور مناظر انہوں نے دیکھے تھے، ان کا فطری نتیجہ یہی ہونا تھا۔ اس لئے کہ ایک ہونہار پودے کو اگر سازگار ماحول میسر آجائے تو پھر اس کے ایک شاداب اور تناور درخت بننے میں کیا چیز مانع ہوسکتی ہے؟

اے ہمارے عظیم رہنما، ہزاروں سلام آپ پر! خدائے رحمان ورحیم آپ کی تربت کو نور سے بھر دے۔ اور آپ کو فردوس بریں میں صالحین اور ابرار کی رفاقت نصیب فرمائے۔

ہم مردہ پرستوں کو زندہ شخصیتوں کی قدر کرنی نہیں آتی۔ ہم تو متاع بردہ کے شیدائی اور فردوس گم گشتہ کے دلدادہ ہیں، اس لئے زندگی میں تو آپ کی قدر ہم نہیں کرسکے، البتہ آپ کے جانے کے بعد ہماری مثال اس یتیم بے نوا کی سی ہے جو اپنے شفیق باپ کے سایہ شفقت سے محروم ہوکر حزن وغم کی آگ میں سلگ رہا ہو۔ اور اپنے شفیق و مہربان باپ کو یاد کرکر کے آنسوؤں کے قلزم بہا رہا ہو ؎

سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی تک روتے روتے سو گیا ہے

جنوری ۱۹۹۱ء

بقیہ آہ مولانا ابواللیث صاحب ندوی

سے اپنا نام خارج کرا دیا۔ یہی سبب تھا کہ گاؤں کا بچہ بچہ ان پر فدا تھا۔ نمود ونمائش اور اپنا کو دوالی شہرت سے وہ کوسوں دور تھے وہ ہمیشہ اختلافات میں اعتدال کی راہ نکالنے کی فکر میں رہتے تھے بعض علمی مسائل کے سلسلہ میں ان کی رائے جماعت کے بعض دوسرے ذمہ داروں سے مختلف رہتی تھی مگر اسے اختلاف کا سبب نہیں بناتے تھے ہر ملی کام میں دوسری ملی جماعتوں سے پورا تعاون کرتے تھے۔ نرم خوئی اور نرم دلی کے باوجود ان کے اندر دینی حمیت بدرجہ اتم موجود تھی۔ آزادی کے بعد گائے کی قربانی پر پولیس کا عملہ بغیر کسی قانونی رکاوٹ کے مداخلت کرنے لگا تھا، ایک بار عید الاضحیٰ کے موقع پر مولانا موجود تھے، داروغہ نے چاند پٹی میں آکر کہا کہ آپ لوگ گائے کی قربانی نہ کریں، مولانا نے پرجوش انداز میں کہا کہ "جب تک اس کے لئے قانون نہیں بن جاتا یہ ہوگی"، چنانچہ وہ واپس چلا گیا اور قربانی ہوئی۔ (بشکریہ ماہنامہ "الرشاد" اعظم گڑھ)

معلوم کرکے یہ حدیث یاد آگئی کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا انتم شہداء اللہ فی الارض۔ اسی بات کو اردو میں زبان خلق کو نقارۂ خدا سمجھو کہہ کر اور ہندی میں پنچ میں پرمیشور کے جملہ سے ادا کیا جاتا ہے۔ مولانا مرحوم کے انتقال کے بعد تو خیر سبھی لوگوں نے ان کا ذکر بہت عمدہ اور بلند الفاظ میں کیا ہی، ان کی زندگی میں بھی ہر طبقہ کے لوگوں سے ان کے بارے میں ہمیشہ بلند کلمات ہی سننے میں آئے۔ اس وقت انھیں میں سے چند کا ذکر مقصود ہے۔

بہت دنوں کی بات ہے مولانا مرحوم بھاگل پور رکنیت کے اجتماع کے سلسلہ میں بھاگل پور تشریف لائے تھے۔ دفتر کے سادہ، خستہ اور کھپریل پوش کمرہ میں کھجور کی چٹائیاں بچھی تھیں۔ مولانا مرحوم بڑی بے تکلفی سے رفقاء جماعت کے ساتھ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اتنے میں شہر کے ایک پرانے عالم اور ملی رہنما مولانا ابراہیم زکریا مرحوم جو مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ کام کر چکے تھے تشریف لائے۔ مجھ سے انھوں نے دریافت کیا کہ امیر جماعت کہاں ہیں؟

میں نے اشارہ کیا، بڑی محبت سے ملے اور فرمانے لگے آپ کی مجلس دیکھ کر حضور کی مجلسیں یاد آرہی ہیں۔ آپ صحابہ کے ساتھ تشریف فرما ہوتے تھے اور کوئی اجنبی آتا تھا تو اسے پوچھنا پڑتا تھا کہ ایکم محمد؟ آپ حضرات میں سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کون ہیں؟

یہ لکھنؤ ہی کا ایک دوسرا واقعہ ہے۔ کسی جلسہ کے سلسلہ میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائے تھے۔ دوسرے بہت سے علماء بھی تھے۔ میں بھی بغرض زیارت حاضر ہوا۔ جماعت اسلامی کا تذکرہ آگیا۔ ایک معروف بزرگ نے جو مفتی بھی تھے مولانا ابواللیث صاحب مرحوم کی طرف کوئی سخت جملہ منسوب کیا۔ حضرت قاری صاحب قبلہ نے فوراً فرمایا کہ ایسا جملہ مولانا ابواللیث صاحب نہیں کہہ سکتے۔ ان کے مزاج میں شرافت اور متانت ہے۔

جامعۃ الفلاح کے ابتدائی دور میں ایک بڑے دیندار استاذ معاشیات اور سیاسیات وغیرہ پڑھاتے تھے۔ سید مناظر احسن ایم اے بی ایڈ مرحوم جماعت اسلامی کے رکن تو نہیں تھے لیکن پوری طرح متفق تھے۔ تمام اجتماعات میں پابندی سے شریک ہوتے تھے۔ وہ جماعت سے اپنے متأثر ہونے کا سبب یہ بتاتے تھے کہ بستی میں جب دینی تعلیمی کنونشن بلایا گیا تھا جس میں قاضی عدیل عباسی مرحوم اور مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب سیوہاروی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا ابوالحسن

علی ندوی دامت برکاتہم وغیرہ شریک تھے۔ اس جلسہ میں مولانا ابواللیث مرحوم بھی شریک تھے ان کی سادگی، معاملہ فہمی اور متانت و شرافت سے میں اتنا متأثر ہوا کہ جماعت سے بہت قریب آگیا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے مولانا صباح الدین صاحب مرحوم دارالمصنفین کے کسی سلسلہ میں لکھنؤ آئے ہوئے تھے۔ ندوہ میں قیام تھا۔ حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم کے سامنے ہی مولانا ابواللیث صاحب مرحوم کا ذکر آگیا۔ مولانا صباح الدین صاحب مرحوم نے بے ساختہ فرمایا کہ مولانا ابواللیث صاحب تو پرانے زمانہ کے بزرگوں کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔ الفاظ تو مجھے نہیں یاد رہے لیکن حضرت مولانا علی میاں دامت برکاتہم نے اس بات کی پوری تائید فرمائی۔

خود حضرت مولانا علی میاں دامت برکاتہم کی زبان سے مولانا ابواللیث صاحب مرحوم کی زندگی میں متعدد بار اور انتقال کے بعد تعزیتی جلسہ کے موقع پر ندوۃ العلماء کی مسجد میں سنا کہ مولانا ابواللیث صاحب کی سادگی، شرافت، متانت اور دینداری نمونہ کی تھی۔ مولانا کے ساتھ طالب علمی اور مصیبت کے زمانہ میں بھی رہا، اور دینی و علمی کاموں کے سلسلہ میں بھی بہت ساتھ رہا۔ مجلس مشاورت کے دوروں میں بڑے بڑے سفر ساتھ کئے۔ بارہا ایسی جگہوں میں جانا ہوا جو خاص ان کا علاقہ تھا لیکن کہیں بھی انھوں نے ایسا نہیں محسوس ہونے دیا کہ میری اہمیت کم ہے۔ مولانا علی میاں دامت برکاتہم نے زور دے کر فرمایا کہ بظاہر یہ ایک معمولی بات معلوم ہوتی ہے لیکن عملاً بہت بڑی بات ہے خال خال لوگ ہی اس کو نباہ سکتے ہیں۔

مولانا مرحوم نے جن مشائخ کا زمانہ پایا ان سب نے مولانا کے سلسلہ میں کلمات خیر فرمائے۔ حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب مجددی رحمۃ اللہ علیہ، ان تمام حضرات کے یہاں حاضری کا کوئی موقع مولانا مرحوم ضائع نہیں فرماتے تھے۔ ان سب حضرات کی دعائیں لیتے تھے۔ خود شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے مولانا مرحوم کی مراسلت ہوئی تھی اور مولانا مرحوم کی شرافت اور حلیم الطبعی سے متأثر ہوکر حضرت شیخ الاسلام نے ملاقات منظور فرمائی تھی۔ اگر یہ ملاقات ہو گئی ہوتی تو مجھے پورا یقین ہے کہ جماعت اسلامی اور علماء

دیو بند کا اختلاف بالکل دور نہیں تو بڑی حد تک کم ہوگیا ہوتا لیکن تاریخ ملت کا ایک سانحہ ہے کہ بعض افسوسناک وجوہ سے ملاقات نہ ہو سکی۔

یہ تو ان حضرات کے تاثر کی ایک جھلک تھی جو جماعت میں داخل نہیں تھے۔ مولانا مرحوم کے بارے میں خود مولانا مودودی علیہ الرحمۃ کا تاثر اس سے سمجھا جاسکتا ہے کہ تقسیم کے بعد ہندوستان کی جماعت کی امارت کے لئے ان کے نزدیک مولانا ابواللیث صاحب سے بہتر کوئی شخص نہیں تھا میری ملاقات شمالی اور جنوبی ہند کے بیشتر پرانے ارکان سے رہی ہے۔ میں نے ہر ایک کو مولانا مرحوم کی دینداری، استقامت، معاملہ فہمی، شرافت اور للہیت کا معترف پایا۔

اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے اور ہمیں ان کی خوبیاں اپنانے کی توفیق عنایت فرمائے۔

(بقیہ:۔ کہاں سے پائیں گے تجھ سا کہیں جسے)

یہ اور اسی طرح کے بے شمار واقعات ہیں جو کچھ نہ کچھ تو ہم پر خود بخود واضح انداز ہوتے رہتے ہیں اور اس لحاظ سے غالباً میرا یہ کہنا غلط نہ ہو کہ آیت کریمہ " قوا انفسکم واھلیکم نارا " اور حدیث شریف " کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ " سے جو ذمہ داری عائد ہوتی تھی ابا کو پورا احساس تھا اور حتی الامکان اس کو ابا نے اللہ تعالیٰ کی توفیق سے پورا کیا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ابا کی خدمات کو قبول فرمائے اور بہترین صلہ عطا فرمائے ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین۔

ابا جان میرے خیال میں ان تمام ہی اوصاف سے متصف تھے جو کہ ایک مومن و مسلم میں ہونی چاہیئے انتہائی زاہد و متقی تھے ایام مرض الموت میں ابا خوف خدا سے برابر مسلسل توبہ و استغفار میں مصروف تھے جوں ہی غنودگی کی کیفیت ختم ہوتی استغفر اللہ، رب اغفر وارحم انت خیر الراحمین اور لا الہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین ابا کی زبان پر جاری ہو جاتا ابا اپنی زندگی میں تعریف و توصیف اور ستائش کو پسند نہ کرتے تھے اور اپنے آپ کو بہت ہی پوشیدہ رکھنا چاہتے تھے۔ لیکن آج جبکہ ابا ہمارے درمیان نہیں رہے اور کسی کی ستائش یا تنقید و تنقیص کا ابا کی ذات پر کوئی اثر پڑنے والا نہیں تو ہم ابا کی تمام تر زندگی کا جائزہ لے کر ہی کچھ سبق حاصل کر سکتے ہیں اللہ تعالیٰ ہمیں ابا کے نقش قدم پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

اللھم اغفر لی ولوالدی وارحمھما کما ربیانی صغیرا

قرون اولیٰ کے مسلمانوں کا نمونہ

مولانا ابواللیث اصلاحی صاحب مرحوم

ڈاکٹر احمد سجاد
پروفیسر رانچی یونیورسٹی

ناقابل فراموش شخصیت

سبھی جانتے ہیں کہ انسانی زندگی چند روزہ ہے ہر شخص کو ایک نہ ایک دن مرنا ہے اور اپنے رب کے حضور اپنے کئے کا حساب دینا ہے مگر دنیا اور فریب دنیا کا کمال یہ ہے کہ بسا اوقات دنیا کے فانی کا نقشہ کھینچنے والے علماء اور دانشور بھی اپنی تمام تر ظاہری اور لسانی رعب و طمطراق کے باوجود عمر بھر قول و فعل کے تضاد کا شکار، کاروبار خود را فضیحت دیگراں نصیحت میں ہمہ دم مشغول رہتے ہیں۔ مولانا ابواللیث صاحب اصلاحی ندوی کے دوستوں اور دشمنوں میں صاحبان جبہ و دستار بھی تھے تو اطلاق خوش بیان اور ارباب بصیرت واقف کار بھی۔ سبھوں نے اپنے اپنے طور پر مولانا مرحوم کو تقریباً نصف صدی تک ہر پہلو سے برت کے اور پرکھ کے دیکھا۔ مگر کسی نے یہ الزام نہیں لگایا کہ مولانا موصوف کے قول و فعل میں تضاد تھا، انھوں نے کسی اعزاز یا عہدے کا استحصال کیا یا ذاتی مفاد کو ملک و ملت یا جماعت کے مفاد پر مقدم رکھا۔

مولانا بہر حال ایک انسان تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان سے متعدد غلطیاں اور کوتاہیاں سرزد ہوئی ہوں جن سے علیم و خبیر ذات ہی خوب واقف ہے۔ مگر ہم نکتہ چیں اور نکتہ شناس انسانوں نے اپنی اپنی بساط بھر نصف صدی تک ان کا مطالعہ کرنے کے بعد یہی پایا کہ وہ اپنی ذاتی، تحریکی اور ملی زندگی میں ایثار نفسی، بے ریائی اور تدبر و دانائی میں اپنے دور کی ایک ناقابل فراموش شخصیت تھے۔

انسانی دماغ بڑا باریک بین اور منطقی ہوتا ہے وہ ہر تاثر کی تفصیل اور ہر دعوے کی دلیل چاہتا ہے۔ اس لئے مذکورہ بالا تاثرات اور اسمائے صفات پر اگر کوئی تاریخی ثبوت اور دلیل کا مطالبہ کرتا ہے تو اسے غیر فطری نہیں کہا جا سکتا۔ لہٰذا ذیل میں مولانا مرحوم کی زندگی کے بعض چند چھوٹے بڑے واقعات کی کچھ جھلکیاں پیش کی جا رہی ہیں تاکہ ہمارا مدعا واضح اور مدلل ہو سکے۔

عام آدمی

سنہ ۱۹۴۷ء کے بعد ملک میں جو عوامی اور جمہوری لہر آئی اس نے ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کی رہی سہی تہذیبی ساکھ، اقتصادی خوشحالی اور عزت و وقار کو ملیامیٹ کر کے رکھ دیا۔ مسلمان جاگیرداروں، تعلقہ داروں اور زمینداروں کا دبدبہ ختم ہو چکا تھا اور محمود و ایاز کا امتیاز مٹ چکا تھا۔ اس عوامی ماحول میں مسلمانوں کی کسی دینی تنظیم و تحریک کو خشت اول سے اٹھانے کے لئے ایک خاص صلاحیت کے "عام آدمی" ہی کی ضرورت تھی جسے مشیت نے مولانا ابو اللیث اصلاحی ندوی کی شکل میں تحریک اسلامی کو عطا کیا۔ موصوف شکل و صورت، قد و قامت، اور لباس و پوشاک غرض ظاہر ہر اعتبار سے اس قدر عام آدمی تھے کہ خاص کا گمان بھی نہ ہوتا تھا۔

۱۹۵۱ء کا واقعہ ہے، جب مولانا موصوف دورۂ بہار کے موقع پر چودھری شفیع احمد صاحب کو اپنے ہمراہ لے کر پہلی بار رانچی تشریف لائے تو چترپور کے ہمدرد جماعت محمد موسیٰ خاں صاحب بھی استقبال کرنے والوں کے جھنڈ میں موجود تھے۔ چودھری شفیع احمد صاحب کے ڈیل ڈول اور صحت و وجاہت سے محمد موسیٰ صاحب اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کے قریب ایک پتلے دبلے جو غیر متاثر سے شخص تھے۔ ان کو ہٹاتے دھکیلتے ہوئے چودھری صاحب کو امیر جماعت سمجھ کے بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ مگر مصافحہ کے بعد جب انہیں معلوم ہوا کہ چودھری صاحب تو ان کے ہم سفر تھے امیر جماعت تو وہی دھکا کھانے والے بزرگ ہیں تو نہایت شرمسار ہوئے۔

کس کے وفادار

رانچی ہی میں عمائدین شہر سے ملاقات کے دو واقعات نہایت دلچسپ ہیں۔ مولانا عبدالرحمٰن کاظمی صاحب نے

شام کی ایک نشست میں اس زمانے میں شہر کے ایک مشہور عالم دین مولانا صوفی جمالی صاحب کو بھی مدعو کیا تھا۔ باتوں باتوں میں ملک کی سالمیت اور یکجہتی کا موضوع چھڑ گیا۔ صوفی صاحب موصوف نے کسی سیاق میں امیر جماعت پر اعتراض کرتے ہوئے یہ سوال کیا "آپ اور آپ کی جماعت ملک کی وفادار ہے بھی یا نہیں؟" — "ہم اور ہماری جماعت اللہ اور اس کے رسول کے وفادار ہیں" امیر جماعت نے برجستہ جواب دیا۔

داڑھی کا قصہ

اسی سفر کے موقع پر ایک اور نشست میں رانچی کے ایک پرجوش نیشنلسٹ کانگریسی نوجوان عبدالقیوم صاحب بعض ملکی و ملی مسائل پر استفادے کے لئے تشریف لائے۔ دوران گفتگو داڑھی کی شرعی حیثیت پر گفتگو چل نکلی تو چودھری شفیع احمد صاحب جن کی داڑھی بھی ان کی قد و بالا اور دبنگ شخصیت کی مناسبت سے تھی، اس مسئلہ پر گفتگو طول پکڑ گئی تو ان سے ضبط نہ ہو سکا اور عبدالقیوم صاحب کو طنزاً کہا کہ جب آپ خود داڑھی رکھ لیجئے گا تو اس مسئلے پر بحث کیجئے گا۔ اس طنزیہ جملے سے عبدالقیوم صاحب خفیف ہو کے رہ گئے۔ مگر مولانا ابواللیث صاحب مرحوم نے چودھری صاحب کی فوراً گرفت کی اور فرمایا کہ گفتگو اور سوالات مجھ سے ہو رہے تھے آپ نے دخل در معقولات کر کے دوہری غلطی کی ایک تو اس نوجوان سے معافی مانگیے۔ اب تو چودھری صاحب موصوف پریشان ہو کر رہ گئے۔ نہایت رقیق القلب اور خدا ترس انسان تھے۔ روتے جاتے تھے اور اس نوجوان سے معافی مانگتے جاتے تھے۔ عبدالقیوم صاحب راوی ہیں کہ اچانک اس پورے منظر نامے نے میری زندگی کا رخ بدل کے رکھ دیا اور کچھ ہی عرصہ کے بعد موصوف رکن جماعت ہو گئے۔ درمیان میں کبھی محترم امیر جماعت سے ملاقات ہوتی تو مزاحاً عبدالقیوم صاحب کو یاد دلاتے کہ ہنوز آپ کی داڑھی دراز نہیں ہوئی آخر کیا قصہ ہے؟

انوکھی مجلس اور نرالی تقریر

شمالی مشرقی ہند میں جماعت اسلامی کے اولین داعی جناب حسنین سید صاحب کی دعوت پر سنہ ۱۹۶۰ء میں امیر جماعت کو شمالی بہار کے ایک اجتماع میں مدعو کیا گیا تو اس موقع پر سمستی پور کالج کے

ایک جواں سال لکچرار کو بھی ان سے ملنے کا اشتیاق ہوا۔ وہ جماعت اسلامی ہند کے امیر محترم کی شخصیت، خطابت اور ان کی نشست و برخاست وغیرہ کا مبالغہ آمیز خاکہ اپنے تخیل میں بناتا ہوا اس مجلس میں حاضر ہوا تو یک لخت اسے سخت مایوسی ہوئی۔ سردیوں کا زمانہ تھا تقریباً سو ڈیڑھ سو افراد کرتے، پائجامے، سویٹر اور شیروانی میں ملبوس بڑے سادہ انداز میں بیٹھے تھے۔ نووارد لکچرار کی نظریں بار بار اپنے تخیل کی شخصیت کو ڈھونڈ رہی تھیں مگر اس کی سمجھ ہی میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر اس چھوٹی سی مجلس میں امیر جماعت ابھی یا وہ کسی وجہ سے شریک اجتماع ہی نہ ہو سکے۔ ابھی وہ اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ متین سید صاحب نے کھڑے ہو کر محترم امیر جماعت سے اختتامی کلمات کی درخواست کی اور بیٹھ گئے۔ اتنے میں ایک ایک کرسی آ گئی جس پر ایک پتلے دبلے سے عام قسم کے آدمی علی گڑھ پائجامہ اور موٹے کپڑے پر ایک معمولی قسم کا فل سویٹر پہنے ہوئے تشریف فرما ہو گئے۔ دعائے مسنونہ کے بعد موصوف نے بالکل سپاٹ اور غیر جذباتی انداز میں اپنی گفتگو کا آغاز کیا تو اس نوجوان کا تخیلی قلعہ تقریباً مسمار ہو گیا۔ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ صاحب کل ہند جماعت اسلامی کے امیر بھی ہو سکتے ہیں۔ موضوع گفتگو بھی اسے نرالا معلوم ہوا جس میں جماعت کی مختلف یونٹوں ارکان اور وابستگان تحریک کی کارگزاریوں کا احتساب اور جائزہ تھا۔ مولانا نے اپنے طویل تجربوں کے ساتھ سادہ انداز میں جائزہ دیتے ہوئے ملک و ملت کی تشویشناک صورت حال اور جماعت کے بلند نصب العین اور مقصد زندگی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وابستگان جماعت کی بعض کمزوریوں اور کوتاہیوں کی نشاندہی شروع کی تو ان کی سادہ اور سپاٹ گفتگو و تقریر بھی بھی متاثر کن ہونے لگی۔ اس کے بعد بڑے مربوط انداز میں موصوف نے اپنی گفتگو کو منصب امارت کی اہمیت بتاتے ہوئے اپنی شخصی معذوریوں اور کمزوریوں کی طرف موڑ دیا۔ اپنا اور ارکان جماعت کا تجزیہ کرتے کرتے ان پر ایسی خشیت طاری ہوئی کہ یارائے ضبط نہ رہا۔ آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ ایسی رقت آمیز گفتگو کی کہ شرکائے مجلس کی آنکھیں بھی رواں ہو گئیں۔ اقامت دین کی کڑی ذمہ داری، حالات کی سختی اور اپنی کوتاہیوں پر بعض شرکاء سسکیاں

بھرنے لگے۔ اسی حال میں بڑے خشوع و خضوع اور آہ و زاری کے ساتھ دعائیں کی گئیں اور نشست کے اختتام کا اعلان کیا گیا تو ایسا محسوس ہوا کہ گرد و غبار سے اٹی ہوئی فضا پر زبردست کی موسلا دھار بارش نے تمام آلودگیوں کو صاف کر دیا ہے۔ گرم اور دھندلی فضا خنک آمیز اور صاف و شفاف ہو چکی ہے۔ شرکاء کے چہروں پر آنسوؤں کی نمی نے ان صورتوں کو منور اور تابان کر دیا تھا۔ اور یوں محض چند لمحوں میں پورا ماحول بدل گیا۔ اب لوگ الگ الگ ٹولیوں میں ایک دوسرے کے ساتھ تبادلۂ خیال اور خوش گپیوں میں مسکراتے ہوئے مشغول نظر آئے۔ وہ نوجوان لکچرار اس اتوار کی مجلس اور نرالی تقریر پر تقریباً دم بخود وہ ماضی کے عظیم الشان جلسوں پر جوش نعروں اور شعلہ بار تقریروں کی یادوں میں گم اپنے ماضی۔ وہ حال کو مختلف پہلوؤں سے الٹ پلٹ کے دیکھ رہا تھا اور یوں اس کے دل کی دنیا میں بھی کئی بھونچال آئے اور گذر گئے۔

جیل کی غذا

مولانا مرحوم کی امارت و قیادت کا اصل سرمایہ ان کا اعتماد علی اللہ، صبر و شکر، ایثار و قربانی اور نظم و ضبط کی پابندی پر مشتمل تھا۔ انھوں نے نہ صرف یہ کہ عمر بھر دولت و اقتدار سے خود کو علیحدہ رکھا بلکہ اپنی پوری متاع حیات تحریک اسلامی کی تشکیل و ترقی اور کارکنان تحریک کے تزکیہ و تربیت میں لگا دی۔

راہ حق کے اس صبر آزما سفر میں انھیں متعدد بار قید و بند کی صعوبتیں بھی جھیلنی پڑیں۔ ان مصائب کو انھوں نے اس مجاہدانہ شان سے جھیلا کہ مجاہدین سلف اور علمائے حق کی یاد تازہ کر دی۔ کئی بار تو ایسا بھی ہوا کہ جیل میں ان کے کوٹے کے معمول کی خوراک یعنی گھی، دودھ، گوشت انڈے اور پھل وغیرہ کی وافر مقدار پیش کی گئی تو انھوں نے یہ کہہ کر از خود کٹوتی کروا دی کہ جیل سے باہر کی آزاد فضا میں اس قدر انواع و اقسام کی نعمتوں کا میں عادی نہیں اس لئے قید و بند کے محدود ایام میں میں اپنی سادہ غذا کی عادت کو خراب نہیں کر سکتا۔

تنخواہ میں اضافے سے انکار

مرکزی مجلس شوریٰ میں ایسا کئی بار ہوا کہ بڑھتی ہوئی گرانی کے پیش نظر امیر جماعت کے کفاف کے سلسلے میں پوری شوریٰ اضافہ کرنے پر مصر ہے مگر مولانا موصوف بضد ہیں کہ انہیں ارکان عام کے معیار

زندگی کے پیش نظر یہ اضافہ ہرگز منظور نہیں۔

اوائل دور امارت میں موصوف نے یہ بھی کوشش کی کہ معمولی تجارت کے ذریعہ اپنے اخراجات پورے کئے جائیں مگر کل ہند جماعت پر بڑھتی اور پھیلتی ہوئی تحریک کے مسائل نے ان کے معمولی کاروبار کو بھی زیادہ دنوں تک چلنے نہیں دیا۔ ابتدائی دور قیام میں بعض نازک مزاج اور حساس ارکان جماعت نے موصوف کو سائیکل سواری سے باز رکھنا چاہا تو مسکرا کے ٹال دیا۔

فقیر کو تازہ چپاتیاں

ایک موقع پر ناشتے میں تازہ چپاتیوں کے ساتھ رات کی بچی ہوئی کچھ باسی چپاتیاں بھی تھیں۔ اتنے میں کسی سائل نے آواز لگائی تو ایک صاحب نے باسی چپاتیاں اس فقیر کو دینا چاہا مگر مولانا نے ان کے ہاتھوں سے باسی چپاتیاں رکھوالیں اور تازہ بھجوا دیں۔

ارکان و احباب کی دلداری

۱۹۷۶ء میں شمیم احمد صاحب رکن جماعت ہزاری باغ ڈی۔ آئی۔ آر کی اور شاہی دفعہ میں بے قصور گرفتار کرلئے گئے تو ان کی ضعیفہ والدہ نہایت پریشان ہوئیں۔ جمشید پور کے ایک اجتماع میں مولانا کو جب اس کی اطلاع ملی تو ایک رکن کی والدہ محترمہ اور ان کے متعلقین کی تسلی کے لئے واپسی میں ہزاری باغ دو گھنٹے تک ان کے گھر پر ٹھہرے اور ان سب کی ہمت افزائی کی۔

مولانا کی افتاد طبع

تقریباً سبھی اس بات کے معترف ہیں کہ ہر رکن بلکہ ملت کے ہر فرد جو ان سے ملنا چاہتا مولانا ان سے گھل مل کر باتیں کرتے۔ مرکز جماعت دہلی کے صحن کے ایک گوشہ میں چند کرسیاں لگ جاتیں اور مولانا عصر تا مغرب وہاں بلا امتیاز ہر شخص سے گھل مل کر باتیں کرتے۔ رمضان کے مہینے میں کبھی کبھی افطار کے وقت اپنی قیام گاہ سے افطار کا سامان نیچے منگوا لیتے اور پھر سب کے ساتھ عام دسترخوان پر بیٹھ کر افطار میں شریک رہتے۔ بعض بے تکلف دینی شخصیتوں کو اپنے پانوں کی ڈبیا سے پان اور چونے سے چھالیہ نکال نکال کے پیش کرتے اور باتیں کرتے رہتے۔

جماعت کی مشہور شخصیت شیخ داؤدی صاحب اور ندیم اللہ صاحب کی کبر سنی، علالت اور ان کی دلی تمنا کی وجہ سے ان کی رکنیت کو قبول کرنے میں غایت درجہ کی عجلت اور رعایت برتی ایسی کمزور اور غیر معیاری ارکان کی تطہیر میں کسی ادنی رعایت سے کام نہیں لیا۔

نظم و ضبط کی پابندی

نظم و ضبط اور جماعت کے وقار کے معاملے میں مولانا نہ صرف خود کو سختی سے ان کا پابند رکھتے تھے بلکہ اس سلسلے میں بڑے سے بڑے ذمہ دار جماعت پر بھی کڑی نظر رکھتے تھے۔ آج سے تقریباً ۲۰۔۲۵ سال قبل جمشید پور کے ایک اجتماع عام میں بہار کے ایک ذمہ دار جماعت نے اپنی کارگزاری رپورٹ میں جب چند غیر محتاط جملے پیش کر دیئے تو مولانا نے اسی نشست میں ان پر گرفت کی تاکہ بر وقت اصلاح ہو سکے۔ اس پر رپورٹ پیش کرنے والے ذمہ دار نے اپنی صفائی میں تاویل کرنی چاہی تو مولانا نے اس تاویل کی بھی تردید کر دی۔ یوں کئی منٹ تک دونوں بزرگوں کے درمیان مکالمہ کی صورت پیدا ہو گئی۔ بالآخر متعلقہ ذمہ دار نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور معذرت خواہی کی تب جا کے کارروائی آگے بڑھی اور اس پورے واقعہ کو شرکائے اجتماع حیرت و مسرت سے دیکھتے رہے۔

ایثار نفسوں کی ٹیم

۱۹۴۸ء تا ۱۹۹۰ء یا استعفاء ۱۹۷۲ء تا ۱۹۹۰ء ۹ سال علاوہ ۳۲ سال تک جماعت اسلامی ہند جیسی عظیم دینی تحریک کی قیادت کرتے رہے۔ اس دوران اپنی ذات ہی نہیں تقریباً اپنے پورے خاندان کے مستقبل کو داؤ پر لگا دیا کہ اس ایثار و قربانی کے بغیر اتنی بڑی تحریک کا اس قدر سخت حالات میں پنپنا اور نشو و نما پانا ممکن ہی نہ ہوتا۔ ان کے ایثار، حکمت و بصیرت اور فراست و مردم شناسی ہی کا کرشمہ تھا کہ اس لئے پٹے کٹے میں مولانا مودودی جیسے بطل جلیل کی قیادت و سیادت سے محرومی کے باوجود مولانا نے تحریک کے اردگرد بہترین افراد اور صلاحیتوں کو جمع کر لیا تھا۔ عالم اسلام کے مشہور دانشور اور صحافی مدیر "تکبیر" محمد صلاح الدین صاحب تکبیر کے تازہ شمارہ میں اعتراف کرتے ہیں کہ:

یہ مرحوم کے فیضِ تربیت اور قائدانہ فراست ہی کا نتیجہ تھا کہ دعوت و تربیت کے ساتھ ساتھ علم و تحقیق کے میدان میں بھی جماعت اسلامی ہند کو کبھی قحط الرجال کا سامنا نہیں کرنا پڑا، اور تحریک کے تمام شعبوں کو رواں دواں رکھنے کے لئے اس کے پاس افرادِ کار کی ایک فعال و مستعد ٹیم ہمیشہ موجود رہی۔ مولانا کے ان ساتھیوں میں، جو ان سے پہلے ہی عزمِ آخرت پر روانہ ہو چکے ہیں — مولانا افضل حسین، مولانا عروج احمد قادری، مولانا محمد مسلم، مولانا سید حامد حسین، مولانا عبدالحی، مولانا سلمان ندوی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔[1]

آج بھی ملک اور بیرون ملک میں ایسے درجنوں علماء اور دانشور موجود ہیں جو نہ صرف ملک گیر بلکہ عالم گیر شہرت کے حامل ہیں، ان میں سے اکثر مولانا کی براہ راست فکری تربیت اور عملی جدوجہد کے ثمر شیریں ہیں۔

بحرانی دور کا سامنا

اس میں شک نہیں کہ ملک میں ملت اسلامیہ کو اس وقت جو چیلنج درپیش ہیں ان کی مناسبت سے جماعت کو ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ مگر اس وقت موضوعِ گفتگو یہ ہے کہ مولانا ابواللیث اصلاحی صاحب پر تقسیم ملک کے معاً بعد جب دور میں امارت کی ذمہ داریاں ڈالی گئیں، اس وقت برصغیر میں ایک سیاسی خلفشار برپا تھا، ماحول پر بحرانی کیفیت طاری تھی۔ آزاد ہندستان کے جدید معاشرہ کو مادی خوشحالی کے علاوہ کسی نظریاتی پہلو سے تشکیل دینے کیلئے بڑی سے بڑی شخصیت آمادہ نہیں تھی۔ اور فرقہ وارانہ ماحول نے تعصب و تنگ نظری کی ایسی دیوار کھڑی کر دی تھی کہ نہ صرف یہ کہ تحریک اسلامی کی آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز بن کے رہ گئی تھی بلکہ بالخصوص شمالی ہند میں مسلمانوں کا بڑے پیمانے پر قتل عام شروع ہو گیا تھا۔ ان سب پر مستزاد یہ کہ بانیٔ تحریک

[1] تکبیر کراچی، شمارہ ۵۱، صفحہ ۹، ۲۰ دسمبر ۱۹۹۰ء

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کو بھی پاکستان نقل مکانی کرنا پڑا۔ جو مولانا ابواللیث صاحب کے حق میں بانیٔ تحریک کا عطا کردہ کچھ بنیادی لٹریچر اور پچھلا ہفت سالہ کمزور سا تنظیمی تجربہ ہی کل اثاثہ رہ گیا تھا۔ اس ملک گیر انتشار و خلفشار اور تہی دستی کے عالم میں سابق امیر جماعت اسلامی ہند مولانا ابواللیث صاحب نے اپنے ۳۰ سالہ دورِ امارت میں اس تنظیم کو ملک کے گوشہ گوشہ میں اس طرح منظم کیا کہ آج تک اس کے مساوی کوئی مسلم تنظیم اس ملک میں کہیں دکھائی نہیں دیتی۔

بڑی بڑی تنظیموں کا خاتمہ

المیہ یہ ہوا کہ بہت سی کل ہند مسلم تنظیمیں جن کے پاس سیاسی و سماجی خدمات کا ایک شاندار ماضی تھا، بدلے ہوئے حالات میں وہ بھی انتشار و بحران کا شکار یا محدود و محصور ہو کر رہ گئیں مثلاً جمعیۃ العلمائے ہند، مسلم لیگ، مومن کانفرنس، خلافت تحریک، خاکسار اور احرار پارٹی وغیرہ اس بحرانی دور میں نوزائیدہ جماعت اسلامی ہند بھی انتشار کا شکار ہو چکی تھی اور وقتی طور پر اس کا شیرازہ بھی تقریباً بکھر چکا تھا۔ مسلمانوں پر کچھ ایسا سکتہ اور سراسیمگی طاری ہوئی کہ مجاہدینِ جنگ آزادی کے بڑے بڑے سورما بھی یا تو کنارے لگ گئے یا سرکاری مشیر بن کر کھپ گئے، بعضوں نے وعظ و ارشاد اور تعلیم و تلقین کی بساط سنبھال لی۔ کیونکہ نئے ملکی تناظر میں جو نئے نئے اور پیچیدہ مسائل ابھر رہے تھے ان کا حل تو کجا ان کا سامنا کرنے میں بھی بڑے بڑوں کا پتہ پانی ہو رہا تھا۔ مثلاً پورے شمالی ہند اور جنوبی ہند تک سابق حیدرآباد اسٹیٹ کے وسیع و عریض علاقے میں مسلمانوں کا قتل عام، خوف و دہشت، بے مقصد ہجرت، نیز تعلیم و تہذیب، اوقاف، مسلم یونیورسٹی، زبان، تہذیب، پرسنل لا وغیرہ کو نیچے سے اوپر تک مسخ کرنے کی مہم، سچ پوچھئے تو چالیس سالہ دور کے بعد بھی آج نہ صرف یہ کہ یہ سارے مسائل علی حالہ برقرار ہیں بلکہ ان کی سنگینی میں صد گونہ اضافہ بھی ہوا ہے۔

ملی سیاست کا خاتمہ

اس انتہائی تشویشناک ماحول میں داخلی طور پر کارپردازان ملت اداروں اور بعض تنظیموں کی طرف سے جماعت اسلامی یا اس کے امیر کی مسلسل اپیل پر ان کی مشکل کشائی تو کیا کی جاتی کہ سب سے پہلے لکھنؤ کے مسلم کنونشن

ملی اکابرین نے اجتماعی یا ملی سیاست کو طلاق مغلظہ دے دی تھی ایک ایسے وقت میں جب انگریزوں کے چلے جانے کے بعد قدرے توازن برقرار رکھنے والی انگریزوں کی تیسری قوت اپنا بوریا بستر لپیٹ چکی تھی اور ہر پانچ سال کے بعد جمہوریت اور الیکشن کے ذریعہ ملک کے مستقبل کا فیصلہ اور فیصلہ لکھا جانا مقدر ہو چکا تھا۔ اکابرین ملت نے اپنی سیاسی کشتی کے پتوار ہی کو توڑ کے پھینک دیا اور خود کو سیاسی طوفانوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔

میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

اس سیاسی خودکشی کے بعد بساط سیاست کے باہروں نے مسلمانوں کے درمیان باہمی اختلاف و انتشار کا ایک نیا دور شروع کیا۔ جماعت نے چونکہ اقامت دین یا اسلامی انقلاب کا نصب العین اختیار کیا تھا اس لیے شکست خوردہ اکابرین ملت کے لیے نفسیاتی طور پر ایک تازیانہ بن گیا اور جماعت ان کی ایک چڑ بن گئی۔ چنانچہ جماعت کے نصب العین، طریق کار اور لٹریچر کا مطالعہ کیے بغیر بعض نامور اکابرین نے محض کچھ تراشوں، حوالوں اور سنی سنائی باتوں پر ضمنی مفصل اور فتویٰ سازی کی عالمگیر تحریک شروع کردی۔ نام نہاد نیشنلسٹ اور سیکولر مسلمانوں نے قرآن و سنت کے آئینے میں اپنی مسخ شدہ صورتوں کو دیکھا تو اپنے رویے کی اصلاح کرنے کے بجائے اس آئینہ اور آئینہ دکھانے والی جماعت کے پیچھے پیچھے لٹھ لے کے پڑ گئے۔

سہ طرفہ وار

ادھر ملکی سیاست کے اونچے ایوانوں سے برہمنی ارباب اقتدار نے بھی جب یہ دیکھا کہ جماعت سوئے ہوئے کو جگانے اور جاگے ہوئے باہمی لڑتے جھگڑتے شیروں کو متحد کرنے میں لگ گئی ہے تو اس نے بھی جماعت کے خلاف خطرے کا بگل بجا دیا۔ یوں دائمی طور پر سہ طرفہ وار شروع ہو گیا ادھر حالات کا اس قدر سخت دباؤ تھا کہ خارجی طور پر جماعت اسلامی ہند کا جماعت اسلامی پاکستان سے جو ربط اول روز ہی سے بالکل منقطع ہو کر رہ گیا۔ حد تو یہ ہے کہ ارکان جماعت کو برسہا برس تک اپنے پاکستانی احباب اور رشتہ داروں سے خط و کتابت تک بند کر لینی پڑی۔

ہندوستان کی تحریک اسلامی کا امتیاز اور مسائل

یہی وہ انتہائی تشویشناک ماحول تھا جس میں مولانا مرحوم نے اپنے مخلص ارکان اور وابستگان جماعت کی جانثاری اور بے لوث تعاون سے اس دینی تحریک کو ملک ہی نہیں بلکہ بیرون ملک تک اعتبار و استحکام بخشا۔

یوں مولانا مرحوم نے اپنی خداداد بصیرت، تدبر اور سلیقہ مندی سے گویا از سر نو جماعت کے بکھرے ہوئے شیرازہ کو دوبارہ مجتمع کیا اور مرکز سے لے کر ملک کے دور دراز مقامات تک اس کی شاخوں کو اولاً مودودی کے دیئے ہوئے خطوط کار پر منظم و مستحکم کیا۔ مگر تقسیم ملک کے بعد اس ملک میں نظم جماعت کے قیام و استحکام کے مسائل نصب العین، نام اور رنگ کے باوجود پاکستان سے بہت حد تک بالکل مختلف ہو گئے۔ اس فرق پر ایک نظر ڈالتے چلیں۔

پاکستان کے مقابلے میں ہندوستان ہر اعتبار سے رقبہ اور وسعت کا حامل ملک بن گیا۔ مگر پاکستان میں مسلمان غالب اکثریت میں ہو گئے تو ہندوستان میں ایک مظلوم اقلیت بن کے رہ گئے۔ ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ ملک کی تقسیم، پاکستان کی تشکیل اور اس سارے سلسلہ کی تباہی جلا کو تباہیوں کا تمام تر ذمہ دار بھی آزاد ہندوستان کے مسلمانوں کو قرار دیا گیا۔ اس کے بعد انتقام در انتقام کا ایک لامتناہی سلسلہ چل پڑا جو آج تک مسلمانوں کے قتل عام اور مکمل تباہی پر منتج ہو رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ جماعت اسلامی پاکستان کو اس طرح کے مسائل سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ چنانچہ بدلی ہوئی اس تشویشناک صورت حال میں مولانا مرحوم نے پٹھان کوٹ کے دارالاسلام کے طرز پر رامپور میں درسگاہ ثانوی کا آغاز کیا، جس کے بہترین نتائج بھی سامنے آئے۔ اس کے ساتھ ہی ملی سطح پر مسلمانوں کی نئی نسل کو دیو مالائی مسخ شدہ نصابیات کے اثرات بد سے بچانے کے لیے افضل حسین صاحب مرحوم جیسے ماہر تعلیم کی مدد سے ملک گیر پیمانے پر جماعتی دینی تعلیمی تحریک کو آگے بڑھایا اور اس سلسلے میں مختلف ریاستوں کی ملی تعلیمی تحریکات کو

۱؎ ملاحظہ ہو تقریر مولانا [illegible] مارچ [illegible] بعنوان "ہندوستان میں تحریک اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل"

مخلصانہ تعاون پیش کیا۔ ہندوستانی ریاستوں کی تشکیل جدید کے بعد علاقائی زبانوں کی اہمیت توقع کے مطابق یکایک بے انتہا بڑھ گئی اس لئے نہ صرف قرآن و حدیث کے تراجم بلکہ بنیادی اسلامی لٹریچر کو ۱۴ — ۱۵ ہندوستانی زبانوں میں منتقل کرنے کی ایک بڑی مہم شروع کرنی پڑی۔

منصب داری سے بے نیازی

'دعوت'، 'ریڈینس'، 'کانتی'، اور دیگر ہم فکر اخبار و رسائل کے تعاون سے اردو زبان و ادب، تہذیب و ثقافت، پرسنل لا، اوقاف اور مسلم یونیورسٹی وغیرہ کا جس طرح مثلہ کیا جا رہا تھا، اس کے خلاف دستوری، قانونی، علمی، رائے عامہ کی بیداری اور ملی ذہنوں کو ملک گیر پیمانے پر متحرک کیا گیا۔ بالخصوص مسلم مجلس مشاورت، مسلم پرسنل لا بورڈ اور بابری مسجد کمیٹی کی تشکیل اور نشوونما میں مولانا کی قیادت میں جماعت نے کلیدی رول ادا کیا، مگر ان تنظیموں پر قبضہ جمانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ ڈاکٹر عبد المغنی صاحب بھی اپنے حالیہ مضمون میں معترف ہیں کہ: —

"واقعہ یہ ہے کہ مولانا مرحوم کی امارت میں جماعت اسلامی ہند کا یہی مزاج بن گیا کہ وہ ملک و ملت کے ہر نیک کام میں منصب داری اور گروہ بندی سے بے نیاز ہو کر بالکل رضاکارانہ شریک ہو اور بے لوثی کے ساتھ کام کو آگے بڑھانے کی کوشش کرے۔[1]"

علمی کارنامہ

ملکی و ملی سطح پر دعوت و تبلیغ اور تنظیم و تحریک کی ان مساعی کے علاوہ مولانا مرحوم نے اپنی زندگی کے شذرات اور مقالات و مضامین کے ذریعہ بھی دعوت و تحریک کے مختلف پہلوؤں پر گرانقدر تحریریں یادگار چھوڑی ہیں۔ ضرورت اس کی ہے کہ ان کی جملہ تحریروں کو مختلف موضوعات[2] کے تحت — ترتیب

[1] "مولانا ابواللیث صاحب جماعت اسلامی اور ملت اسلامیہ" سہ روزہ دعوت دہلی، صفحہ ۹ مورخہ ۲۸ ستمبر [illegible]

[2] (اگلے صفحے پر دیکھیں)

دے کر شائع کرایا جائے کہ ان میں ملک و ملت کے گوناگوں عصری مسائل پر قرآن و سنت کی روشنی میں مدبرانہ غور و فکر کی راہیں ہموار کی گئی ہیں۔ بعض مسائل میں مولانا کی بعض راؤں سے دوسرے لوگوں کا اختلاف ممکن ہے مگر اختلاف کرنے والے بھی اس بات سے اتفاق کریں گے کہ مولانا اپنی راؤں میں نہایت سنجیدہ، محتاط، ہمدرد، متین، ٹھنڈے، غیر جذباتی اور معروضی طرز اظہار کے عادی تھے۔ چنانچہ جذباتی اور انتہا پسندانہ ماحول میں وہ ہزار اشتعال اور اکساہٹ کے باوجود سکوت اختیار کر لیتے تھے۔ بعض معاملات میں مولانا کی طویل خاموشی پر کچھ لوگ شاکی بھی ہو جایا کرتے مگر مولانا ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو بالعموم نظر انداز کر دیا کرتے تھے۔

متوازن فکر

مولانا کی ہمہ جہتی فکر، اور غایت درجہ محتاط انداز بیان کو ان کی ہر تقریر اور تحریر میں آپ نمایاں طور پر محسوس کریں گے۔ یہاں اس کا موقع نہیں کہ ان کی جملہ تحریروں اور افکار کا مطالعہ یا خلاصہ پیش کیا جا سکے مگر ان کا مشہور مقالہ جو روزنامہ دعوت دہلی کے ۱۳ فروری [illegible] کے شمارہ میں "پس چہ باید کرد" کے عنوان سے شائع ہوا تھا

[2] (حاشیہ صفحہ ۴۸ کا) مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی نے مولانا مرحوم کی بعض اہم تصانیف کو شائع بھی کیا ہے۔ ذیل میں ان کی فہرست دی جا رہی ہے، مگر ابھی بہت سی تحریریں باضابطہ طور پر شائع شدہ نہیں ہیں۔

۱۔ دعوت اسلامی ہندوستان میں
۲۔ مغرب اور اسلام کی دعوت
۳۔ جماعت اسلامی چند حقائق و الزامات
۴۔ حالات حاضرہ اور ہماری ذمہ داریاں
۵۔ دو یادگار تقریریں
۶۔ ہندوستان کا مستقبل اور جماعت اسلامی کی دعوت
۷۔ ملک و ملت کے مسائل اور ان کا حل
۸۔ ملک و ملت کے چند قابل توجہ مسائل
۹۔ الیکشن اور مسلمان
۱۰۔ نس بندی اور اسلام
۱۱۔ بھارت کا [illegible] (ہندی)
۱۲۔ تشکیل جماعت اسلامی کیوں اور کیسے
۱۳۔ ملک و ملت کے مسائل اور مسلمانوں کی ذمہ داریاں

مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی نے اسے دوبارہ اگست ۱۹۹۰ء میں "الیکشن اور مسلمان" کے زیر عنوان شائع کردیا ہے۔ اس ایک ہی مقالہ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوجائے گی کہ مولانا نے حال کے حقیقت پسندانہ تجزیہ کے ساتھ ساتھ مستقبل کے کچھ خطرات کی جس طرح پیشین گوئی کی تھی آج تقریباً تین دہائیوں کے بعد وہ حرف بحرف صحیح ثابت ہورہی ہے۔ مولانا کے تدبر اور دور رس نگاہ پر اور بھی قائل ہونا پڑتا ہے جہاں انھوں نے ان خطرات سے نبرد آزما ہونے اور ان مسائل کے حل کی طرف اشارے کئے تھے۔ کاش ملت اسلامیہ ہند بشمول وابستگان جماعت اسلامی ہند پوری یکسوئی کے ساتھ مولانا کی بتائی ہوئی تدبیر پر عمل پیرا ہوئے ہوتے۔

الیکشن اور مسلمان

اس ایک ہی مقالہ میں مولانا نے ملک کی تشویشناک صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے آغاز ہی میں جتادیا تھا کہ خوش امیدی عبث ہے کیونکہ ملکی سیاست ارتقا کی محتاج ہے۔ اس لئے یہاں کی جمہوریت ابھی کاغذی ہو کر رہ گئی ہے۔ مگر اس صورت حال میں مولانا نے مسلمانوں کو خود اعتمادی سے کام لینے کی ترغیب دیتے ہوئے واضح لفظوں میں یہ کہہ دیا ہے کہ علیحدگی پسندی خودکشی کے مترادف ہوگی۔ انہوں نے آزادی کے بعد سے ہندستان میں جارحانہ نیشنلزم اور کمیونزم سے پیدا خطرے کی طرف اشارہ کیا تھا۔ آج ہم ان خطروں کو چشم سر سے دیکھ رہے ہیں کہ ساری دنیا بشمول کمیونسٹ بلاک کمیونزم سے بیزار ہو چکا ہے مگر ہندوستانی میں جارحانہ قوم پرستی، اس کی فسطائیت اور قتل و غارت گری سے تنگ آکر ہندستانی عوام کمیونزم یا بائیں بازو کے رجحانات میں اپنی عافیت کا پہلو ڈھونڈ رہی ہے۔ مولانا نے مادیت، الحادیت پرستی، مذہبی استحصال اور کمیونزم کے حربوں کی نشاندہی اور ان سے نمٹنے کے طریقوں پر گفتگو کرتے ہوئے ہندوستان ملت کو ان کی ذمہ داریاں یاد دلائی ہیں اور خبردار کیا ہے کہ :

"اب مزید تاخیر کے بعد حالات قابو سے باہر ہوجائیں گے اور پھر کف افسوس ملنے کے سوا کوئی چارۂ کار باقی نہ رہے گا۔" (صفحہ ۲۳)

مسلم مجلس مشاورت کا بیج

ملی مسائل کے حل کے ضمن میں مولانا نے وقتی مصالح کے تحت کونشنوں اور بڑے بڑے جلسوں کے بجائے مشاورتی اجتماع کی ضرورت اور اس کے دائرہ کار پر زور دیا ہے۔ اسی تجویز کے نتیجے میں بالآخر کئی برسوں کے بعد مسلم مجلس مشاورت کی تشکیل عمل میں آئی۔

انتخابات کی اہمیت

اس کے بعد حالات سے نبرد آزمائی کے ذیل میں انتخابات کی اہمیت اور محدودیت کا بھی مختلف پہلوؤں سے جائزہ لے کر جو محتاط اور متوازن طریق کار تجویز کیا بالآخر جماعت نے اسی طرز فکر کو اختیار کیا۔ مولانا کے لفظوں میں :-

"ہمارے نزدیک الیکشن کی اہمیت جو کچھ بھی ہے وہ کسی مادی منفعت کی بجائے اس پہلو سے ہے کہ یہ پبلک سے ربط و تعلق کا ایک بہترین ذریعہ ہے اور پبلک سے تعلق پیدا کرکے مسلمان ملکی حالات و مسائل پر بھی اپنا مخصوص اثر جو ڈالنا چاہتے ہیں، ڈال سکتے ہیں۔ کیونکہ بہرحال یہاں جمہوریت رائج ہے اور جمہوریت اپنے تمام تر نقائص اور کمزوریوں کے باوجود حالات پر اثر انداز ہو رہی ہے اور آئندہ جمہوری مزاج کے ارتقاء کے ساتھ اس میں ابھی مزید ترقی رونما ہونے والی ہے۔ (صفحہ ۲۶-۲۷)

اسی نکتے کو جماعت اسلامی ہند کے ایک اور فاضل جلیل محترم مولانا صدرالدین اصلاحی صاحب مدظلہ اپنے انداز میں اس طرح پیش کرتے ہیں :-

"پارلیمانی انتخاب کی راہ سے اسلامی نظام کے قیام کا تصور یقیناً ایک ایسا تصور ہے جس کا انبیائی دعوتوں کی تاریخ میں کوئی نشان نہیں مل سکتا۔ لیکن اس کی وجہ یہ ہرگز نہیں کہ ان زمانوں میں جمہوریت اور پارلیمانی انتخاب کا سسٹم موجود تھا مگر حضرات انبیاء نے اس سسٹم کو بہرحال میں ناقابل اختیار سمجھ کر اسے کلی طور پر رد کر دیا تھا۔ بلکہ یہ ہے ان دنوں اس سسٹم کا

سرے سے وجود ہی نہیں تھا۔ اس لئے اس کے بارے میں ان کا کوئی قول بھی نہیں پایا جا سکتا۔ ایسی حالت میں آج اگر اس کے متعلق ہم کوئی رائے قائم کرنا چاہیں گے تو اس کے متعلق بھی تمام تر انحصار اجتہاد فکر ہی پر کرنا ہوگا اور وہی راہ قابل اختیار ٹھہرے گی جو زمانے کے حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے دین کے اصول اور دینی مصالح کا تقاضا نظر آئے گی۔

جمہوریت کے اس دور میں جبکہ کسی بھی فکری اور عملی انقلاب کے لئے انتخاب کا راستہ کھلا ہوا ہے اور دوسرا ہر راستہ رد کر دیا گیا ہے۔ دینی بصیرت کا فیصلہ یہی ہوگا کہ اسلامی انقلاب کے لئے بھی اس راستہ کو اپنایا جانا چاہیئے اور لازماً اپنایا جانا چاہئے۔ ــه

شہادت حق اور خدمت خلق مشکلات کا حقیقی حل

مگر مولانا نے بجا طور پر الیکشن کے بجائے شہادت حق اور خدمت خلق کو مشکلات کا حقیقی حل بتایا ہے اور مسلمانوں کی اصل حیثیت بھی بتا دی ہے کہ وہ اس ملک میں اقلیت نہیں بلکہ داعی ہیں۔ آگے چل کر ملکی مشکلات میں مسلمانوں کے رول کو بتاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

"... ملک کا دستور جمہوری ہے اور اس نے ہر ایک کو اس کا موقع فراہم کیا ہے وہ عوام میں گھس کر ان تک اپنی باتیں پہنچا سکے" (صفحہ ۳۳)

پھر شہادت حق کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کرتے ہوئے موصوف نے عصر حاضر میں سیاست کی اہمیت کو ان الفاظ میں واضح کیا ہے۔

"اتنی بات تو واضح ہے کہ شہادت حق کے دائرہ سے سیاست کو خارج کر دینا کسی طرح بھی صحیح نہیں ہو سکتا۔ سیاست بھی اسلام کا ایک ضروری

ــه تحریک اسلامی ہند، مرکزی مکتبہ اسلامی ہند، مئی ۱۹۷۱ء، صفحہ ۲۰۶

جزو ہے اور مسلمانوں کے مسائل بھی اس سے نہایت گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ اس لئے اس سے الگ ہو کر ان کو حل کرنے کی امید نہیں کی جا سکتی۔ البتہ ملت کے ارباب فکر اس کے اشکال و حدود پر غور کر سکتے ہیں۔" (صفحہ ۳۴)

سیاسی کشمکش کے بغیر نظام فلاح؟

اسی حقیقت کو مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے تفقہ و تدبر کے جانشین مولانا نعیم صدیقی صاحب نے اپنے انداز میں اس طرح پیش کیا ہے۔

"تاریخ میں کوئی ایک مثال بھی موجود نہیں ہے کہ فاسد قیادت کے زیر سایہ کوئی نظام فلاح پنپ سکا ہو اور بغیر سیاسی کشمکش کے محض وعظ و تبلیغ اور انفرادی اصلاح کے کام سے اجتماعی انقلاب نمودار ہو گیا ہو۔ ورنہ گذشتہ تیرہ صدیوں میں خلافت راشدہ کے بعد وعظ و ارشاد و تبلیغ و تکبیر، تعلیم و تزکیہ کے عنوان سے عظیم الشان مساعی، مساجد، مدارس اور خانقاہوں کے اداروں کے تحت عمل میں آتی رہی ہیں اور آج بھی علماء، صوفیاء، اصحاب درس اور ارباب تصانیف زبان و قلم سے جتنا کام کر رہے ہیں اس کی وسعت حیران کن ہے لیکن اس کے باوجود اس حد مطلوب تک افراد کا تزکیہ ہو سکا اور نہ کبھی معاشرہ کی اتنی اصلاح ہو سکی جس کے نتیجے میں اجتماعی نظام بدل جائے اور محمد رسول اللہ صلعم کا انقلاب دوبارہ رونما ہو سکے۔ صاف ظاہر ہے کہ طرز فکر، نقشۂ کار، نظریۂ انقلاب میں کوئی بڑا جھول ہے اور وہ بڑا جھول یہی ہے کہ قیادت کی تبدیلی کے لیے سیاسی کشمکش کئے بغیر افراد کو نظام تمدن سے منقطع کر کے دعوت کا مخاطب بنایا جاتا رہا ہے۔"

(محسن انسانیت از مولانا نعیم صدیقی صفحہ ۴۰)

مقالہ کے بالکل آخر میں شہادت حق کے کچھ اور پہلوؤں سے بحث کرتے ہوئے انھوں نے انتخابی سیاست کی پیچیدگیوں اور اس سلسلے میں مسلمانوں کی پراگندہ خیالی کو

بھی بڑی خوبی سے واضح کر دیا ہے اور اپیل کی ہے کہ "وہ اپنے موجودہ اختلافات کو دور کر کے اپنے اندر نظم و اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کریں" (صفحہ ۳۹)

مذہبی طبقہ کی مخالفت

مولانا مرحوم کی اس مخلصانہ جد و جہد، واضح تحریروں اور تقریروں کے باوجود، ارباب اقتدار کی طرح جمود وستار کی طرف سے دشنام طرازی اور تحقیر و تذلیل کرنے کا سلسلہ جاری رہا۔ دار العلوم دیوبند اور ندوہ وغیرہ سے جس زمانے میں فتووں اور مخالفانہ تحریروں کا سیلاب امڈ رہا تھا، مولانا نے ان اداروں کی بہی خواہی سے خود کو کبھی الگ نہیں کیا۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب سے تا آخر وقت تک نہایت مخلصانہ تعلقات رہے۔ ندوہ کے اجلاس اور نشستوں میں بالالتزام شرکت کرتے رہے۔ دار العلوم دیوبند کے بھی ہمیشہ خیر خواہ رہے۔ اتنا ہی نہیں جماعت کے خلاف مولانا حسین احمد مدنیؒ کے بعض الزامی خطوں کو جب اچھالا جانے لگا تو مولانا مرحوم نے مولانا مدنی کی بزرگی اور احترام کو پوری طرح ملحوظ رکھتے ہوئے ان سے برابر مودبانہ درخواست کی کہ موصوف مذکورہ غلط فہمیوں کے سلسلے میں تبادلۂ خیال کا موقع عنایت فرمائیں۔ ان گذارشات پر مشتمل مولانا مرحوم کی مراسلت کا وہ قیمتی ریکارڈ کتابی صورت میں بحمد اللہ محفوظ ہے۔ جس میں مولانا کی عاجزی و انکساری اور ان کی دردمندی اور دلسوزی کی آنچ کو آج بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ غرض ملک، ملت، جماعت، مخالفت اور قید و بند کی ہر صورت میں عمر بھر گھرے رہنے کے باوجود مولانا مرحوم نے صبر و ضبط اور توازن و للّٰہیت کے دامن کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ دینی و تحریکی زندگی کے مختلف نشیب و فراز میں مولانا نے چھوٹی سے چھوٹی خدمت اور بڑے سے بڑے منصب پر پوری ذمہ داری، خلوص اور لگن کے ساتھ کام کیا۔ لوگ گواہ ہیں کہ ایک علاقہ کے شدت پسندوں سے مقابلہ کی باری آئی تو مولانا نے نوجوانوں اور بوڑھوں کی کمان بھی سنبھالی اور جماعت اسلامی ہند جیسی دینی تنظیم و تحریک کی قیادت بھی کی۔ درمیان میں ۱۹۷۲ء تا ۱۹۸۱ء نو سال تک امارت کی ذمہ داریوں سے الگ رہے تو جامعۃ الفلاح کی نظامت میں کوئی عار محسوس نہیں کی۔

بقیہ صفحہ ۲ پر

مولانا ابواللیث صاحب — اپنے ماتحتوں کے درمیان

عبدالحق فلاحی دہلی

مولانا ابواللیث صاحب — جو اب اپنے رب کے جوار رحمت میں پہنچ چکے ہیں اور اس کی بے پایاں عنایات اور فیضان کرم سے شاد کام ہو رہے ہوں گے، پر کچھ لکھنا جہاں ایک طرف میرے لیے باعث سعادت اور خوش بختی ہے وہیں دوسری طرف میرے لیے یک گونہ وجہ آزمائش بھی۔ باعث سعادت ہونے کی بات یہ ہے کہ وہ نہ صرف یہ کہ میرے امیر اور قائد تھے بلکہ مربی اور محسن بھی تھے اور میں انہیں اپنا روحانی باپ تصور کرتا تھا۔ ان سے میرا تعلق دفتری حدود سے نکل کر گھریلو نوعیت کا بھی تھا۔ بنا بریں، میں اور میرے اہل و عیال مولانا کی خلوت و جلوت کے عینی شاہد تھے۔ اس بنا پر، ان کے محاسن اور محامد بیان کرنے کا اگر کوئی ایسا موقع آئے تو اسے میں اپنے لیے باعث سعادت ہی سمجھوں گا۔

وجہ آزمائش یوں ہے کہ مولانا مرحوم سے میرا جو نہایت قریبی تعلق رہا ہے جو کم و بیش آٹھ سال کے عرصہ پر محیط ہے، وہ بڑی حد تک دفتری اور تحریکی ہونے کے علاوہ ذاتی بھی ہے۔ اسے میں اپنی کمزوری ہی پر محمول کرتا ہوں کہ مولانا کی وفات کے بعد اب تک احباب اور شناساؤں کی تحریک اور خود اپنی خواہش کے پیش نظر جب بھی مولانا مرحوم کی زندگی کے پہلو گوشے اجاگر کرنے کے خیال سے قلم اٹھایا تو دل گیر ہو کر رہ گیا اور کچھ لکھنے سے قاصر رہا۔ اور کم و بیش اب بھی یہی کیفیت ہے۔

ایک اور آزمائش کی وجہ جس کا ذکر غالباً بے محل نہ ہوگا یہ ہے کہ ان کی حیات کے ایک خاص زاویہ پر لکھنے کی مجھ سے خواہش کی گئی ہے جو سرنامۂ مضمون سے واضح ہے اگرچہ مجھے اس پر لکھنے کا پابند تو نہیں کیا گیا ہے تاہم احباب کی خواہش کا احترام یوں بھی ضروری ہے محسوس یہ ہوتا ہے کہ کسی خاص سبب سے ہی اس عنوان پر اظہار خیال کی فرمائش کی گئی ہے۔

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہوں جسے

مولانا مرحوم کے انتقال سے جماعت اسلامی ہند کی مجلس نمائندگان میں جو خلا، پیدا ہوا اسے پُر کرنے کے لیے رکن سے سرکلر جاری ہوا۔ میرے سامنے جب رائے دہی کی نوبت آئی تو جماعت میں ان کا متبادل تلاش کرتے وقت بے ساختہ میری زبان - اور قلم پر بھی - یہ مصرعہ آگیا۔

شعر ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہوں جسے

مولانا ابواللیث صاحب کی قدآور شخصیت، ان کی علمی حیثیت، قائدانہ صلاحیت فہم وتدبر اور ذہانت وزیرکی کے بارے میں ہم سنتے آئے تھے۔ میں اسے اپنی خوش نصیبی سمجھتا ہوں کہ مجھ ہیچ میرز کو مولانا جیسے عظیم انسان کی معیت نصیب ہوئی اور ان کی صحبت میں رہنے اور ان سے کسب فیض کرنے کا موقع ملا جس کا مجھے وہم وگمان بھی نہ تھا۔

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم

مولانا مرحوم دفتر میں اپنے معاونین اور ماتحتوں سے بہت خوش دلی اور اپنائیت سے پیش آتے اور اس معاملہ میں ان کا منصب قطعاً حارج نہ ہوتا تھا۔ آرام کے اوقات کے علاوہ ہر کارکن ان سے کسی بھی وقت مل سکتا تھا۔

مولانا مرحوم نے اپنے گرد کوئی مصنوعی حصار کبھی نہ کھینچا جس کا اثر یہ تھا کہ وہ اپنوں کے علاوہ جماعت کے باہر کے حلقوں میں بھی یکساں قدر اور احترام کی نظر سے ہمیشہ دیکھے جاتے رہے اور اس کا کھل کر اظہار اس وقت ہوا جب مرکز جماعت میں مولانا کے سانحۂ وفات پر تعزیتی جلسہ منعقد کیا گیا اور اس میں تقریباً تمام ہی دینی وملی جماعتوں کے نمائندوں نے شرکت کی اور ہر ایک نے اپنے تجربات اور احساسات کی روشنی میں اپنے اپنے تاثرات کا اظہار کیا اور مرحوم کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا۔

ایک خاص بات جو مولانا مرحوم کے تئیں محسوس کی گئی وہ یہ تھی کہ کارکنان مرکز ان کے اخلاق اور رویہ سے ذاتی طور پر بھی متاثر تھے۔ جس طرح دنیا کے تمام معاملات میں کچھ نہ کچھ استثنار ہوتا ہے، بعض لوگوں کی رائے اس سے مختلف بھی ہو سکتی ہے لیکن اگر اکثریت کے نزدیک کوئی چیز بہتر ہو تو چند ایک افراد کا اس سے مختلف رائے رکھنا یہ معنی نہیں رکھتا کہ وہ

بہتر نہیں ہے۔ ذاتی طور پر مولانا مرحوم رفقاء مرکز اور کارکنوں سے جس طرح محبت آمیز اور مشفقانہ رویہ رکھتے تھے اس کی مہک اور خوشبو ان کے عتاب میں بھی محسوس ہوتی ہے۔

کسی قائد کی قدر وقیمت کا اندازہ اور اس کے اوصاف حمیدہ کا ذکر تو لوگ اس کی زندگی میں کرتے ہی رہتے ہیں مگر اصلی قدر وہ ہے جو اس کے مرنے کے بعد کی جاتی ہے عہدے اور منصب کے دباؤ کی وجہ سے قائد کی زندگی میں اس سے اختلاف رائے ظاہر کرنا یا اس پر تنقید کرنا بسا اوقات مشکل ہوتا ہے مگر اس کے دنیا سے گذر جانے کے بعد یہ ساری رکاوٹیں ختم ہو جاتی ہیں اور انسان برملا اس رائے کا اظہار کرتا ہے جو اس کے دل میں ہوتی ہے مولانا کے انتقال کو ۳ ماہ ہو رہے ہیں مگر ابھی تک میرے کان کسی ایسی بات (تبصرے تنقید) سے ناآشنا ہیں جو ان کے سلسلے میں کارکنوں ملازمین کی طرف سے کہی گئی ہو۔

یہاں مرکز میں پیر وجواں، اکابر واصاغر، سب ہی مولانا کا بے حد ادب واحترام کرتے تھے، اور مرکز کے کیمپس میں "مولانا" سے مراد مولانا ابواللیث صاحب کی ذاتِ گرامی ہوتی تھی۔ یہ احترام ان کے عہدے اور منصب کی بنا پر نہ تھا بلکہ ان کے علم وفضل، تقویٰ اور پرہیزگاری، شاندار ماضی اور اعلیٰ اخلاق وکردار کی وجہ سے تھا۔ ان کی بزرگی اور عظمت کا احساس ان کے سلسلہ میں منعقد کیے جانے والے تعزیتی جلسہ اور اس کی روداد سے کیا جا سکتا ہے کہ اپنوں کے علاوہ غیروں نے شدید نظریاتی اختلاف رکھنے کے باوجود مرحوم کو شاندار خراج عقیدت پیش کیا۔ جلسہ کی کارروائی ٹیپ کرلی گئی تھی، تفصیلی روداد ان کیسٹوں کو سن کر معلوم کی جا سکتی ہے۔

اس موقع کی ایک بات یہ کہ میری تحریک پر مولانا مرحوم کے ایک دیرینہ رفیق (جو رکن تو نہیں البتہ جماعت کے دیرینہ ہمدرد وبہی خواہ ہیں) جناب محمد خالد اعظمی صاحب کو اظہار خیال کی دعوت دی گئی وہ اسٹیج پر آ گئے تو ضرور مگر جذبات پر شدت کا یہ عالم تھا کہ دو چار جملے بھی نہ بول سکے، حالانکہ ان کے پاس کہنے کے لیے بہت کچھ تھا۔ آواز بھرّا گئی، گلا رُندھ گیا، دل بھر آیا، آنکھیں نمناک ہو گئیں اور معذرت کرکے وہ اپنی نشست پر واپس چلے گئے۔

موجودہ دور میں انسانوں اور خاص طور سے قائدین اور لیڈروں کی پوزیشن

یہ ہے کہ وہ پبلک میں بہت مقبول اور ہردلعزیز ہوتے ہیں اور ماحول پر کچھ ایسا تاثر طاری ہوتا ہے کہ اس وقت ان جیسا کوئی نہیں مگر درونِ خانہ کیفیت معلوم کیجئے تو "این ہمہ خانہ آفتاب است" کا نظارہ ہوتا ہے۔ قریبی لوگ اکثر شاکی اور نالاں ہوتے ہیں اور ان صاحب کا ذکر آجائے تو منہ بسور لیتے ہیں۔ مولانا مرحوم اپنے گھر میں، دفتر میں، اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک — ہر جگہ یکساں عزت واحترام پاتے تھے۔

عفوو درگذر

امارت کا آخری دور مولانا مرحوم کے لئے ایک طرح سے آزمائشوں کا دور (صحت نے مولانا کا ساتھ نہ دیا (حالانکہ صحت قائم رکھنے کا وہ باقاعدہ اہتمام کرتے تھے) اور اس کا اثر مزاج اور قوتِ کارکردگی پر پڑنا ایک فطری بات تھی۔ خود مولانا کے گھریلو احوال بھی دو ڈھائی سال تک اچھے نہیں رہے جماعت کے اندر پیدا ہونے والے نت نئے مسائل مستزاد۔ مگر ہم نے دفتر میں ان سے نہایت قریب رہ کر — جہاں کسی دیوار کا بھی فاصلہ نہیں تھا — ان کے مزاج پر برہمی یا اشتعال کا اثر نہیں دیکھا۔ حسب معمول وہ دفتر آتے اور اپنے ضروری کام انجام دیتے۔ دفتری امور میں کارکنان ہدایات و مشورے لیتے، ملک و بیرون ملک سے آنے والے اپنے اور پرائے، رفقاء و احباب، اکابرین اور دانشورانِ ملت سیاسی لیڈران، بیرون ملک سے آنے والے علماء، بڑی شخصیات اور وفود سے ملتے مگر کبھی یہ نہیں محسوس ہوتا کہ مولانا کسی مسئلہ سے دوچار ہیں یا کسی اور طرح الجھن کے شکار ہیں۔

اس تمہید کا مدعا دراصل یہ تھا کہ ناخوشگوار نجی احوال اور شدید نفسیاتی دباؤ کے باوجود ماتحت کارکنوں سے گفتگو اور Dealing پر وہ اثر نہیں پڑنے دیتے تھے ہم نے مولانا کی ذات میں غیر معمولی قوت برداشت اور حالات کا اتار چڑھاؤ جھیلنے کا وصف بلکہ ملکہ دیکھا۔

مولانا کے دورِ امارت میں جماعت کے اندر الیکشن کے مسئلے کو لے کر کچھ ناعاقبت اندیش لوگوں نے زبردست خفیہ تحریک چلائی جس کا ظاہری اقتضا یہ تھا کہ جماعت دو پھاڑ ہو جائے نشانے پر مولانا کی ذات تھی۔ حالانکہ خود مولانا مرحوم بحالات موجودہ الیکشن میں حصہ لینے کے قائل نہیں تھے اور وہ اس مسئلہ میں ہمیشہ غیر جانب دار رہے۔ ارکانِ شوریٰ کی کثرت رائے

کے احترام میں انہوں نے اس مسئلہ سے اپنے آپ کو علیحدہ کر لیا تھا۔ بالآخر یہ خفیہ تحریک ناکام ہوئی اور وہ سارے چہرے بے نقاب ہوئے جو در پردہ اس میں عملاً حصہ لے رہے تھے یا پشت پناہی کر رہے تھے کسی طور پر حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ ان میں کچھ سادہ لوح لوگ بھی تھے جو غیر ارادی یا غیر شعوری طور پر سرگرم، لوگوں کے آلۂ کار بنے۔ بالآخر ایک وقت وہ بھی آیا جب ۸۶ء میں مولانا مرحوم اس تمام تر جد و جہد، دماغ سوزی اور عرق ریزی، کے باوجود خدائی فیصلے کے تحت دوبارہ امیر جماعت منتخب ہوئے اور اس ٹولہ کی ساری امیدوں اور آرزوؤں پر اوس پڑ گئی۔ مولانا مرحوم کے سامنے وہ سارے چہرے بے نقاب ہو گئے تھے جنہوں نے ظاہری طور پر یا ڈھکے چھپے ان الیکشن مخالف، اور زیادہ صحیح لفظوں میں جماعت مخالف سرگرمیوں میں حصہ لیا تھا مگر ع

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

مولانا نے اپنی ذات کے لیے کسی سے کسی سطح پر بھی انتقام نہیں لیا حالانکہ یہ خفیہ تحریک ایسی تھی جو پوری جماعت کو سبوتاژ کر دینے کے لیے کافی تھی اور مولانا بحیثیت امیر جماعت دستوری طور پر ان سارے لوگوں کے خلاف سختی سے سخت کارروائی کر سکتے تھے، مگر ہمارے اپنے علم واطلاع کے مطابق ایک شخص کے خلاف بھی کارروائی نہیں کی گئی۔ یہ تھا مولانا کا ظرف اپنے ماتحتوں کے ساتھ۔

تواضع اور سادگی

مولانا ابواللیث صاحب اپنوں اور غیروں میں ایک مقبول، ہردلعزیز اور قابل احترام قائد ہونے کے باوصف "ہٹو بچو" سے ہمیشہ مجتنب رہے۔ اپنے ارد گرد کبھی انہوں نے مصنوعی حصار نہیں کھینچا اور خود کو کسی خول میں بند نہیں کیا۔ بڑے لوگوں کے ساتھ اکثر یہ مجبوری ہوتی ہے کہ وہ اپنی زیادہ مصروفیات کی وجہ سے اپنے اوقات منضبط رکھنے کے لئے اپنے گرد و پیش اپنے قد و قامت اور حیثیت کے اعتبار سے کوئی بڑا حصار ضرور کھینچ لیتے ہیں۔ مولانا مرحوم نے اپنی تحریک اور جماعت میں یہ شاندار اور قابل رشک روایت قائم کی کہ اس کے قائد اور امیر سے کوئی کبھی بھی مل سکتا ہے۔ کوئی ضروری نہیں کہ وہ جماعت ہی کے کام سے آئے تو اس کے لئے فراخ دلی کا مظاہرہ ہو۔

مولانا کی یہی شان ان کی نشست و برخواست، آمد و رفت اور سیر و سفر میں بھی تھی۔ ذاتی عمر اور ضعف صحت کے پیش نظر وہ اس کا اہتمام بآسانی کرسکتے تھے کہ کسی کو ہمیشہ اپنے ساتھ سفر میں رہنے کے لیے پابند کرلیتے مگر اخیر عمر تک انہوں نے اس کا التزام نہیں کیا اور نہ کسی کو دم چھلہ بنایا جو ہمیشہ ان کے آگے اور پیچھے پھرتا رہے۔ صبح کو پارک میں بعد نماز فجر تفریح اور ورزش کے لیے جاتے تو تنہا جاتے اور تین دن کے مسلسل سفر پر جاتے تو تنہا ہوتے، کبھی کبھار کسی کارکن کو احتیاطاً ساتھ رکھ لیا ہو تو وہ اور بات ہے۔

۱۹۸۲ء میں دوبارہ امیر منتخب ہونے کے بعد بنگال و بہار کا جو پہلا دورہ مولانا مرحوم نے کیا اس میں مجھے ان کی معیت حاصل رہی اس پورے سفر میں جو قریب ایک عشرہ پر محیط تھا۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ مولانا ان بہت ساری علتوں سے پاک ہیں جو ایسے مواقع پر چھوٹی بڑی حیثیت کے قائدین، ماتحتوں کارکنوں اور والنٹیرس سے اپنے لیے اہتمام اور التزام کراتے ہیں۔ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مولانا مرحوم نے کھانے پینے میں کوئی اہتمام اور التزام نہ کرکے اپنی صحت کا نقصان گوارا کیا مگر منتظمین اجتماع پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ انہیں کسی خاص پرہیز یا اہتمام کی ضرورت ہے۔ مولانا بواسیر کے مریض تھے اور انہیں بڑے کا گوشت کھانے کی سخت ممانعت تھی گھر پر وہ بکرے کا ہی گوشت استعمال کرتے تھے۔ مگر اپنے مشاہدہ میں یہ آیا کہ دوروں کے مواقع پر اپنے لیے کسی اہتمام کی فرمائش نہ کرکے رفقاء میں کسی درجہ میں امتیاز یا عدم مساوات کا احساس نہیں ہونے دیا۔ جب کہ اگر وہ ایسا کرتے تو بحیثیت ایک مہمان کے ان کا یہ جائز اور واجب حق ہوتا۔

تحمل و بردباری

ایسے مواقع پر مولانا مرحوم کا صبر و ضبط بھی دیکھنے کے قابل ہوتا تھا۔ اسی بنگال کے دورے کے موقع پر کلکتہ کے کچھ احباب نے مولانا کو کھانے پر مدعو کیا۔ خاکسار بھی شریک دعوت تھا، ایک رکن جماعت نے تو حد کردی اور عام مولویوں پر قیاس کرکے مولانا کو بھی آزمانا چاہا۔ میزبان موصوف نے جو بنگال کی جماعت میں معروف آدمی ہیں، دسترخوان کو جو کی روٹی سے آراستہ کر رکھا تھا۔ جس کا حال یہ تھا کہ اسے سالن میں تر کرکے منہ تک لقمہ جاتے جاتے ٹوٹ کر گر جاتا تھا۔ دو چار لقمہ کھانے کے بعد مجھے اندازہ ہوگیا

کہ آزمائش کے بطور یہ قیمتی ڈش بطور خاص تیار کرایا گیا ہے۔ مولانا کو بھی میں خود سے دیکھتا رہا مگر کیا مجال کہ زبان پر اُف کا لفظ آیا ہو یا چہرے سے ناگواری کا اثر ظاہر ہوا ہو۔ یا بعد میں کسی نجی محفل میں راستہ میں اس کا ذکر کیا ہو۔ انہیں جتنا کھانا تھا، نہایت سکون کے ساتھ کھا کر فارغ ہوگئے۔

مشرقی یوپی کے ایک دورے کے موقع پر میں نے دیکھا کہ مولانا کا اور میرا کھانا اگرچہ مولانا کی قیام گاہ میں پہنچا دیا گیا تھا تاہم وہ وہی کھانا تھا جو عام رفقاء اور شرکاء اجتماع کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ آلو کی سبزی تھی شوربہ اتنا تلخ تھا کہ نومبر کے مہینے میں مولانا کا چہرہ سرخ اور پسینہ سے تربہ تر ہو رہا تھا۔ مولانا نے بڑے صبر و سکون سے پورا کھانا کھایا۔ کیا مجال کہ حرف شکایت زبان پر آجائے اور کہیں کہ کس پھوہڑ نے کھانا تیار کرایا ہے۔ میں نے اپنے طور پر بعد میں تحقیق کی تو پتہ چلا کہ مطبخ سے متعلق دو صاحبان نے اپنے اپنے طور سے سالن میں مرچیں ڈال کر کھانے کا ذائقہ "دو آتشہ" کردیا تھا۔

کفایت شعاری

ایک بار مولانا اپنے وطن چاند چھپر تشریف لے جارہے تھے۔ عشاء کا وقت تھا۔ مجھے دفتر کے کاموں سے فرصت تھی، لمبی چھٹی پر جارہے تھے۔ ریلوے اسٹیشن تک انہیں رخصت کرنے کی مجھے بھی خواہش ہوئی۔ چنانچہ مرکز کے گیٹ پر جب وہ رکشہ میں حسب معمول دفتر کے ایک ملازم کے ساتھ بیٹھے تو میں نے بھی ساتھ چلنے کے لیے ایک رکشہ روکنا چاہا مولانا نے منع کردیا۔ میرے اصرار کے باوجود جب مولانا نے ساتھ چلنے سے روکا تو چار و ناچار مجھے رکنا ہی پڑا۔ آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ اس وقت میری کیا کیفیت رہی ہوگی اور کیا جذبات موجزن رہے ہوں گے۔ چنانچہ اس "غیرت" کا میرے قلب و دماغ پر کچھ دن تک بڑا اثر رہا۔ مگر بعد میں مجھے خود محسوس ہوا کہ دراصل میری اور میرے ساتھ موقع پر موجود دوسرے رفقاء اور کارکنوں کی تربیت کا یہ بھی طریقہ تھا کہ بلا ضرورت جماعتی صرفہ پر کوئی صاحب استقبال یا الوداع کے لیے اسٹیشن نہ جائیں۔

استغناء اور بے نیازی

مولانا کی زندگی کا ایک خاص پہلو جو قابل ذکر ہے، وہ ان کی سادگی، استغناء پسند اور قناعت شعار طبیعت تھی۔ گھر کے

اندر سے کہ جماعت کے مرکزی دفتر تک میں ایک ہی رنگ جھلکتا تھا۔ مولانا کے بعض مداحوں کی اس بات میں مبالغہ ہو سکتا ہے کہ "انہیں دیکھ کر عہدِ صحابہ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے"، تاہم جن لوگوں نے مولانا کی خلوت و جلوت کا قریب سے مشاہدہ کیا ہے اور جنہوں نے ان کے وطن میں ان کا گھر دیکھا ہے۔ وہ اس بات کی ضرور گواہی دیں گے کہ ایک طویل عرصہ (۳۲ سال) تک جماعت اسلامی ہند کی قیادت اور رہنمائی جیسے عظیم منصب پر فائز رہ کر ان کی زندگی کے معیار میں کوئی فرق نہیں آیا۔

یادش بخیر سنہ ۷۲ء میں جب وہ امیر منتخب ہو کر مرکز جماعت اسلامی ہند دہلی تشریف لائے تو چند ماہ بعد ایک شخص مولانا کے دفتر میں ملاقات کے لیے آیا۔ وہ متحیر نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھتا رہا (میری نشست بھی مولانا کے دفتر ہی میں تھی) اس نے مولانا سے پوچھا کہ امیر جماعت کون ہیں۔ مولانا نے جواب دیا کہ میں ہی ہوں۔ سائل کے خیال میں یہ بات کچھ بڑی عجیب و غریب سی تھی کہ اتنے معمولی کپڑے (پرانا کرتہ، پاجامہ اور دوپلیا ٹوپی) میں ملبوس کوئی شخص جماعت اسلامی ہند کا امیر کیسے ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے قدرے توقف کے ساتھ کہا، "شاید آپ کچھ غریب معلوم ہوتے ہیں" مولانا نے کسی جھنجلاہٹ اور غصہ کے بغیر بڑے ٹھنڈے دل سے جواب دیا کہ "اللہ کا شکر ہے، اس کا دیا ہوا سب کچھ ہے۔ کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے"۔

مولانا کی سادگی، فقر و استغنا، اور قناعت پسند طبیعت کا اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے دراصل مولانا نے جس طرح خود اپنے لیے یہ رنگ فقر و استغنا پسند کیا تھا اسی طرح وہ اپنے رفقاء ماتحتوں اور تمام کارکنوں پر اس کی چھاپ دیکھنا چاہتے تھے اور عملاً انہوں نے اس کی تربیت بھی دی۔ سادگی ان کی زندگی کا جوہر تھی۔ انہوں نے اپنے گھر میں بھی اس کی چھاپ چھوڑی۔ اپنے دور امارت تک جماعت کو بھی اسی پٹری پر چلاتے رہے۔ بعد والوں کے لیے بھی چلتے چلاتے اپنی آخری تصنیف جو جماعت کی تشکیل جدید کے سلسلہ میں ایک دستاویزی حیثیت رکھتی ہے۔ "تشکیل — جماعت اسلامی ہند کیوں اور کیسے" کے صفحہ ۲۵ ایک کل ہند اجتماع کے اخراجات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کفایت شعاری کا عندیہ

پیش کیا ہے اور رفقاء و متوسلین جماعت کو سوچنے کا ایک زاویہ دیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ مولانا مرحوم کسی ظاہری تام جھام اور ٹیپ ٹاپ کے بغیر بھی اپنے ہم عصروں میں مقبول رہے اور اس گئی گذری حالت میں بھی ملک و ملت کے اندر جماعت کا ایک وقار محسوس کیا جاتا رہا۔

احتساب

مولانا ابواللیث صاحب اپنے ماتحت کارکنوں کے لیے شفقت و محبت اور مہر و مروت سے پیش آتے تھے وہیں گاہے گاہے حسب ضرورت احتساب بھی کیا کرتے تھے۔ اور یہ احتساب "کڑوے سچ" کی طرح بہت سخت ہوتا تھا۔ اس احتساب کے ذریعہ کارکنوں کے ذمہ سپرد کاموں کی نگرانی ہو جایا کرتی تھی۔ بات بہت چھوٹی سی ہے مگر اس پر اور باتوں کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے بالخصوص روپئے پیسوں کے معاملہ میں تو بہت پھونک پھونک کر قدم رکھتے تھے۔

عصر بعد معمول کے مطابق مرکز کے کارکنوں کو اور موقع پر موجود باہر سے آجانیوالے حضرات کو چائے پلائی جا رہی تھی۔ مولانا صحن مرکز میں حسب معمول تشریف رکھتے تھے۔ اور چائے نوش فرما رہے تھے چند ایک دوسرے صاحبان بھی مولانا کے سامنے بیٹھے تھے۔ ناظم مہمان خانہ نے کچھ اچھے قسم کے لذیذ بسکٹ مولانا کے سامنے لا کر رکھ دیئے۔ مولانا نے اس میں سے کچھ کھایا اور کہا کہ یہ تو بہت اچھے قسم کے بسکٹ ہیں کہاں سے آئے۔ اتنے میں ایک کارکن بول پڑے کہ آج انہوں نے مہمان خانہ کا چارج دیا ہے، یہ اسی کی خوشی میں ہے۔ پھر کیا تھا مولانا غضب ناک ہو گئے، ناظم مہمان خانہ کو طلب کیا گیا اور ان سے جواب طلب کر لیا گیا۔ مولانا نے فرمایا کہ اگر یہ بھی کوئی خوشی کا موقع ہے تو اس کا بار جماعت پر کیوں ڈالا جا رہا ہے؟ (یہ تو اپنے پاس سے خرچ کیا جانا چاہیے) ناظم مہمان خانہ نے صفائی پیش کی کچھ مہمان باہر سے آئے تھے۔ ان ہی کے لیے یہ منگوایا تھا بسکٹ آنے سے پہلے پہلے وہ لوگ واپس چلے گئے۔ مولانا نے ہدایت فرمائی کہ اگر وہ لوگ چلے ہی گئے تھے تو اسے الماری میں بند کر کے رکھ دیتے دوسرے مہمانوں کے کام آجاتا۔

اسی طرح دیگر مدات کی رقوم کے سلسلہ میں بھی گاہے گاہے جائزہ لیتے اور اس

سلسلہ میں بے قاعدگی یا بے ضابطگی پر سخت تنبیہ فرماتے۔

مولانا کے اسی مزاج کا یہ اثر تھا کہ ایک بار مرکز میں اخبارات و رسائل وغیرہ کے مطالعہ کے لیے ریڈنگ روم کا افتتاح ہوا، قیم جماعت جناب افضل حسین صاحب ریڈنگ روم میں تشریف رکھتے تھے صبح کا وقت تھا کسی نے ازراہ مذاق کہا کہ ریڈنگ روم کا افتتاح ہو رہا ہے، کچھ تو منھ میٹھا کرانا چاہیے۔ مرحوم قیم جماعت نے خود اپنی جیب سے پرس نکالا اور اس میں سے بیس روپے مٹھائی لانے کے لیے ایک ملازم کو دیے۔

جذبۂ ایثار

یادش بخیر، تقسیم ملک کے بعد جب ملیح آباد میں جماعت اسلامی ہند کا دفتر قائم ہوا تو جناب افضل حسین صاحب مرحوم اس نئے مرکز میں ایک اچھے سرکاری عہدے سے استعفا دے کر جماعت کی خدمت کے لیے حاضر ہوئے، موصوف اس وقت جھانسی میں ٹیچرس ٹرینگ اسکول کے انسپکٹر تھے اور اخیر اخیر میں الہ آباد کے مشہور تاریخی تاسیسی اجتماع میں شرکت کی تھی۔

مرکز میں آنے کے ساتھ ہی موصوف نے امیر جماعت کی ہدایات پر اپنا کام شروع کر دیا۔ نہ جماعتی منصب قبول کرتے وقت انھوں نے امیر جماعت سے یہ دریافت کیا کہ کیا حق الخدمت یا معاوضہ ملے گا اور نہ ہی بعد میں پوچھا، البتہ ماہ کے اختتام پر امیر جماعت نے ان سے بلا کر پوچھا کہ آپ کا ماہانہ خرچ کیا ہے۔ انھوں نے گھر کے تمام اخراجات جوڑ کر اسّی روپے بتائے، چنانچہ انھیں اتنی رقم مشاہرہ میں دی جانے لگی تھوڑے ہی دنوں بعد مولانا کو کسی طرح محسوس ہوا کہ شاید قیم صاحب کا خرچہ پورا نہیں ہوتا اور تنگی رہتی ہے چنانچہ مولانا نے بغیر قیم صاحب کی ایما یا ان کی طلب کے، قیم صاحب کی تنخواہ میں اضافہ کر دیا جو خود مولانا کی اپنی تنخواہ سے بھی زیادہ تھی یہ رقم غالباً ایک سو ﷲ روپے تھی۔ یہ واقعہ خود قیم صاحب مرحوم نے اپنی زندگی میں کسی فرصت کے لمحے میں ہمیں کوئی بات سمجھاتے ہوئے بتایا تھا۔

مذکورہ واقعہ ۱۹۴۸ء کا ہے جو مولانا کی جماعتی منصبی زندگی کا آغاز تھا اور عمر بھی کوئی ۳۵، ۳۶ سال رہی ہوگی۔ اس عمر میں مولانا کا یہ ایثار کہ اپنے ماتحتوں کو ان کی

اگر یہ ضروریات کے پیش نظر اپنے سے کچھ سوا ہی دیا جائے ــــ بعد کے لوگوں کے لیے ایک تابناک اور روشن مثال ہے۔

مولانا مرحوم ہی کے دور امارت میں مرکز اور اس کے ذیلی اداروں کے کارکنوں کے لیے کفاف سسٹم جاری ہوا جس کے لیے مفصل ضوابط وضع کیے گئے اور جس کی رو سے ایک کم تر درجے کا کثیر العیال کارکن بڑے منصب کے ذمہ دار سے زیادہ تنخواہ پانے کا مجاز تھا۔

خوئے دل نوازی

اخیر زمانہ قیام دہلی کے دوران جب مولانا کی امیرانہ حیثیت باقی نہ رہی تھی، مرکز کے ایک جواں سال ہر دلعزیز رفیق اور کارکن جناب شبیبی صاحب کی اہلیہ کا دوران علاج اسپتال ہی میں انتقال ہوگیا۔ اس تکلیف دہ سانحہ کی جسے بھی خبر ہوئی دل پکڑ کر رہ گیا۔ شبیبی صاحب کی رہائش اوکھلا میں ابوالفضل انکلیو میں ہے جہاں جماعت کا نیا کمپلیکس زیر تعمیر ہے جو یہاں سے ۱۵ - ۱۶ کلو میٹر دور ہے۔ اس موقع پر مرکز کے تمام ہی رفقا اپنے اپنے طور سے غمزدہ رفیق کی تعزیت کے لیے اور مرحومہ کے جنازہ میں شرکت کے لیے پہنچے، راقم الحروف جب مرکز سے ان کی تعزیت کے لیے روانہ ہوا تو مولانا سے بھی ملا اور انھیں اپنے ارادے سے مطلع کیا۔ مولانا نے اپنی طرف سے تعزیت کرنے کے لیے فرمایا اور خرابی صحت کی بنا پر، شرکت کی خواہش کے باوجود، معذرت پیش کرنے کے لیے کہا۔ مولانا ان دنوں بہت کمزور ہو گئے تھے اور باجماعت نماز کے لیے مسجد جانا مشکل ہوتا جو مشکل سے ۳ / ۴ منٹ کے راستہ پر ہے۔ میں نے اپنی طرف سے شبیبی صاحب کی تعزیت کی اور مولانا کی طرف سے بھی اور ان کا پیغام بھی پہنچا دیا۔ دو روز بعد مجھے یہ معلوم کر کے سخت حیرانی ہوئی کہ مولانا خود تن تنہا بڑی خاموشی سے بذریعہ بس اوکھلا گئے اور شبیبی صاحب کی تعزیت کر کے واپس آگئے۔

اس واقعہ میں بظاہر کوئی ندرت کا پہلو نہیں ہے لیکن جن لوگوں کو اوکھلا کے بار بجوم روٹ پر بس سے سفر کا تجربہ ہے انھیں یہ سن کر سخت حیرانی ہوئی۔ اور خود مجھے بھی اس کا علم دوسروں کے ذریعہ ہوا۔ دراصل یہ نتیجہ تھا اس اخلاص و محبت کا اور جذبۂ یگانگت کا جو مولانا اپنے ماتحت کارکنوں اور رفقا سے رکھتے تھے۔

گھریلو ضروریات کے شدید تقاضے کے پیش نظر جب چند ماہ بعد شبیبی صاحب نے بچوں کی دیکھ بھال کے لیے دوسری شادی کی تو اس موقع پر بھی مولانا نے انہیں بھرپور مبارک باد دی۔ اس وقت مولانا اپنے وطن چاندپٹی تشریف لے جا چکے تھے اور مولانا کا مرکز میں موصول ہونے والا یہ آخری خط تھا۔ اس خط کی ایک ایک سطر سے اس کیفیت کا اظہار ہوتا ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا۔

جناب افضل حسین صاحب مرحوم (سابق قیم جماعت) کے اہلِ خانہ نے عدت وفات پوری ہونے کے بعد جب مرکزی رہائش گاہ سے اوکھلا میں واقع اپنے ذاتی مکان میں منتقل ہونے کا عندیہ ظاہر کیا تو مولانا مرحوم نے ان کے چھوٹے صاحبزادے قمر افضل صاحب کو سینے سے لگایا، پیٹھ تھپتھپائی اور تسلی دی اور کہا کہ جب تک میں یہاں مرکز میں ہوں، تم لوگ یہیں رہو۔

جناب افضل صاحب قیم جماعت کے سانحۂ وفات سے مولانا کو بہت زیادہ صدمہ ہوا اور بہت دن تک اس کی ٹیس محسوس کرتے رہے۔ انہیں وہ اپنا دست راست سمجھتے تھے۔ مذکورہ واقعہ کو اسی روشنی میں دیکھا جانا چاہئے۔

اسے اتفاق ہی کہا جائے گا کہ سال ۹۰ء کے پہلے مہینے (یکم جنوری) میں قیم صاحب کا انتقال ہوا اور اسی سال کے آخری مہینے کے پہلے ہفتہ میں مولانا بھی چل بسے گویا سال بھر بھی اپنے رفیق کی جدائی برداشت نہ ہوئی۔

ماتحت کارکنوں سے ہمدردی محبت اور اخلاص ہی کا نتیجہ تھا کہ مولانا عملاً ان کے دکھ درد میں شریک ہوتے اور ضرورت کا تقاضا ہوتا تو خاموشی کے ساتھ ان کی مالی امداد کی بھی ہدایت فرماتے۔

کچھ اپنے بارے میں

مولانا مرحوم نے مجھ ناچیز پر جہاں مہر و محبت اور شفقت و مروت کے پھول برسائے وہیں میری ذہنی و فکری، علمی و عملی تربیت کے لیے سخت سے سخت انداز بھی اختیار فرمایا جو اس وقت یقیناً برا لگا تھا مگر اب سوچتا ہوں کہ یہ سب کچھ میرے اپنے فائدہ کے لیے تھا اور دل میں اس کی قدر محسوس کرتا ہوں۔

مجھ پر جو راحت و رنج کے لمحے آئے مولانا مرحوم نے ایسے مواقع پر بھی میری مدد کی اور پوری پوری دلجوئی کا سامان فرمایا جسے میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ میرے نوزائیدہ بچے عزیزی جمال یوسف سلمہٗ کی غیر معمولی بیماری اور انتہائی مہنگے علاج کے دوران میری کسی طلب کے بغیر مولانا نے میرے اضطراری احوال و ظروف کا اندازہ کر کے از خود مرکز سے امداد دلوائی اور جب بچے کا انتقال ہو گیا، تو از راہ کمال عنایت از خود جنازہ کی نماز پڑھائی حالانکہ قیام دہلی کے دوران میں نے کبھی بھی مولانا کو نماز پڑھاتے نہیں دیکھا، نہ عام نمازیں اور نہ کسی کی جنازہ کی نماز) یہ ۲۷ رمضان ۱۴۰۷ھ کا واقعہ ہے۔ مغرب کا وقت تھا صحن مرکز میں نماز ادا کی گئی، نماز جنازہ سے فارغ ہوئے تو مولانا نے فرمایا، ذرا بچے کو دکھانا سنا تھا بہت خوبصورت ہے اور واقعۃً بچہ اسم بامسمیٰ تھا) میں نے چہرہ کھول کر دکھایا مولانا نے بچے کا چہرہ دیکھا، اسے گود میں اٹھایا اور یہ کہتے ہوئے میرے حوالے کیا۔ للہ ما اعطیٰ ولہٗ ما اخذ والحمد للہ علیٰ کل حال۔

مولانا مرحوم کا ایک خط

اب میں مولانا مرحوم کا ایک خط نقل کرتا ہوں جس سے یہ اندازہ ہو سکے گا کہ مولانا اپنے خوردوں اور ماتحت لوگوں سے کیسے مخاطب ہوتے تھے۔ یہ خط مولانا کے اخلاص و کرم حسن و ظن شفقت و محبت اور ان کی عظمت و بزرگی کا آئینہ دار ہے اور مجھ سے وہ یک گونہ جو خصوصی لگاؤ رکھتے تھے۔ اس کی ایک جھلک بھی اس خط میں ملے گی۔ یہ خط مولانا نے اپنے وطن چاندپٹی سے اپنی وفات سے ۲ ماہ قبل تحریر فرمایا تھا جو دہلی میں مجھے ڈاک سے موصول ہوا۔

۱۰ اکتوبر ۹۰ء
چاندپٹی، ضلع اعظم گڈھ

بخدمت جناب عبدالحق صاحب فلاحی
مرکز جماعت اسلامی ہند

برادرِ عزیز
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ نے خط لکھنے میں واقعی بہت دیر لگائی در آنحالیکہ مجھے آپ کے خط کا

برابر انتظار رہا لیکن اس کی وجہ سے آپ کے بارے میں مجھے کوئی غلط فہمی یا بدگمانی لاحق نہیں ہوئی کیونکہ مجھے آپ کی مصروفیتوں کا حال معلوم تھا، اور آپ میرے ساتھ جو قلبی لگاؤ رکھتے ہیں وہ مجھ پر مخفی نہیں ہے۔ اب عبدالرشید صاحب کی واپسی کے بعد یقیناً آپ کا بار ہلکا ہوا ہوگا۔ توقع ہے اب خط لکھنے میں آپ زیادہ تاخیر سے کام نہ لیں گے۔

آپ کے خط سے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ دہلی سے ہمارے چلے آنے کے بعد ہماری رہائش گاہ میں جو سامان چھوٹ گیا تھا ان میں سے خراب ہونے والی چیزوں کو عطاء الرحمن وغیرہ کو دے دیا اور بقیہ سامان اپنے پاس محفوظ رکھا ہے۔ آپ اسے کسی معتبر آنے والے کے ذریعہ بھیجیں گے۔ معلوم نہیں وہ کیا سامان ہے۔

بلریا گنج تو لوگ آتے ہی جاتے رہتے ہیں اور وہاں تو میاں جمیل سلمہٗ بھی زیر تعلیم ہیں کوئی اور نہ ملے تو مدرسہ کھلنے پر آپ انھی کو دیکھنے کے لئے وہاں کا قصد کر سکتے ہیں۔ وہاں سے چاندپٹی کچھ زیادہ دور نہیں ہے اور راستہ آپ کا دیکھا ہوا بھی ہے۔

آپ کے خط سے بعض نئی باتیں معلوم ہوئیں جو کسی اور ذریعہ سے معلوم نہیں ہو سکی تھیں ..... اور اس سلسلہ میں آپ کا تاثر بھی معلوم ہوا۔

آپ کی اہلیہ اور بچوں کی صحت و عافیت کے لیے دعا کرتا ہوں۔ یہ بچے انس اور ریحانہ بہت یاد آرہے ہیں۔ ہمارے بچوں سے یہ بچے بہت مانوس تھے اور ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ صالحہ اور ساجدہ سلمہما آج کل میکے میں ہیں۔ یہ بھی سب کو سلام عرض کرتی ہیں۔

والسلام

(دستخط ابواللیث)

یہ چند تاثرات تھے جو جستہ جستہ قلمبند کئے گئے ورنہ ظاہر ہے کہ ان کی حیثیت کسی مستقل مضمون کی نہیں ہے۔ خواہش تو یہ تھی کہ مولانا مرحوم کی حیات اور خدمات کے مختلف

پہلوؤں پر باقاعدہ تیاری کے ساتھ کچھ لکھوں لیکن اس کام کے لئے جو یکسوئی اور فراغت درکار ہے وہ سردست میسر نہیں ہے۔ معلوم نہیں یہ خواہش کب عملی جامہ پہنتی ہے۔ دراصل تقسیم ملک کے بعد جماعت اسلامی کی تشکیل جدید کے وقت اور اس کے کچھ عرصہ بعد تک جماعت کو جن سنگین اور نازک مسائل اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور جس خوش اسلوبی سے مولانا مرحوم نے اس کو منجدھار سے نکالا، ضرورت ہے کہ تحریک اقامت دین کا کام کرنے والی نئی نسلوں تک اسے صحت کے ساتھ منتقل کیا جائے۔ اسی طرح ۱۹۷۲ء سے لے کر اختتام امارت کے دور تک ملک وملت جس مد و جزر سے دوچار ہوئے اور جو شکست و ریخت کے ادوار آئے اس میں مولانا نے جو رہبری کی وہ اس بات کی متقاضی ہے کہ اسے بھی ضبط تحریر میں لایا جائے۔ مختلف ملکی وملی مسائل میں مولانا نے جو اظہار خیال کیا ہے اور جو تحریریں اس سلسلہ میں دستیاب ہیں ان کو سلیقہ سے سلسلہ وار مرتب کیا جائے۔

میں نے خود مولانا مرحوم سے ان کی امارت کے دوران میں گاہے گاہے کئی بار توجہ دلائی اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ آپ ان یادداشتوں کو املا کرا دیں یا خود کچھ اشارات لکھیں، لیکن ان کی انکسار پسند طبیعت اس کے لئے آمادہ نہیں ہوئی۔ آخری آخری دور میں جب وہ جماعت کی ذمہ داریوں سے فارغ ہوئے تو انہوں نے دوسرے تمام علائق اور ذمہ داریوں سے خود کو یکسو کر کے اپنے وطن میں رہ کر تصنیف و تالیف کا نقشہ بنایا مگر سوء اتفاق کہ زندگی نے وفا نہ کیا۔ البتہ یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ جماعت اسلامی ہند کی تاسیس جدید کے سلسلہ میں "تشکیل جماعت اسلامی — کیوں اور کیسے؟" مرتب کر کے انہوں نے ایک بڑی امانت تحریک کے سپرد کر دی۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کے ان حسن عمل اور حسن کردار کو شرف قبول عطا فرمائے اور انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے اور ان کی فروگذاشتوں سے صرف نظر فرمائے۔ آمین

یاایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی۔

مولانا ابواللیث صاحب جماعت اسلامی اور ملّت اسلامیہ

ڈاکٹر عبدالمغنی

مولانا ابواللیث ندوی، سابق امیر جماعت اسلامی ہند کی وفات نہ صرف جماعت بلکہ پوری ملت اور وسیع تر معنوں میں ملک نیز عالم اسلام کا نقصان ہے اس لئے کہ انھوں نے جن حالات میں جتنی مدت تک ہندوستانی مسلمانوں کی سب سے منظم تنظیم کی سربراہی کی، وہ ایک زبردست کارنامہ ہے۔ اور انھیں ملک ہندوستان کے دیگر مسلم رہنماؤں سے ممتاز کرتا ہے۔ ان کے امتیاز کا ایک خاص سبب یہ بھی ہے کہ انھوں نے جماعت کی قیادت بڑی خاموشی سے کی، اور اپنی شخصیت کے بجائے صرف تنظیم کو نمایاں کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ پچھلے ۳۰ سال میں مرحوم ملی وملکی وحدت کی ایک اہم علامت بن گئے تھے انھوں نے متعدد مواقع پر مختلف اجتماعی مسائل کے حل کے لئے دوسرے اداروں اور افراد کے ساتھ اس انداز سے تعاون کیا کہ خدمت تو سب سے آگے بڑھ کر انجام دی۔ مگر اپنے آپ کو ہمیشہ پیچھے رکھا۔ مسلم مجلس مشاورت کے قیام کے وقت اس میں شامل ہو کر سب سے زیادہ تنظیمی کام جماعت اسلامی نے کیا۔ لیکن اس کے ذمہ داروں نے تنظیم پر قبضہ جمانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اسی طرح مسلم پرسنل لا بورڈ میں بھی جماعت شریک ہے۔ اور صرف خدمت انجام دیتی ہے۔ بابری مسجد ایکشن کمیٹی میں بھی جماعت کی شمولیت کا طور یہی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا مرحوم کی امارت میں جماعت اسلامی ہند کا یہی مزاج بن گیا کہ وہ ملک وملت کے ہر نیک کام میں منصب داری اور گروہ بندی سے بے نیاز ہو کر، بالکل رضاکارانہ شریک ہو۔ اور بے لوثی کے ساتھ کام کو آگے بڑھانے کی کوشش کرے۔

مولانا مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ اور ندوۃ العلماء لکھنؤ کے فارغ التحصیل عالم وفاضل تھے ندوۃ العلماء میں وہ مدرس بھی رہے۔ مدینہ بجنور کے ادارے سے بھی وابستہ رہے۔ عالم دین ہونے کے علاوہ انگریزی داں بھی تھے۔ ایک صحافی کی حیثیت سے ان کے مضامین عالمانہ ہوتے تھے جن میں سادگی بیان کے ساتھ منطقی تجزیہ ہوتا تھا۔ وقتاً فوقتاً مختلف موضوعات پر جب وہ قلم اٹھاتے تھے تو پوری معلومات کافی غور وفکر اور بصیرت وفراست کے ساتھ ان کی تحریریں موضوع بحث کے تمام پہلوؤں کا احاطہ بحسن وخوبی کیا کرتی تھیں اور ان میں جا بجا فکر انگیز نکتے پائے جاتے تھے۔ جن سے زیر بحث مسئلے کے حل کی راہیں نکلتی تھیں۔ مثال کے طور پر مسلم

پرسنل لا تحریک اور اس کے لئے بورڈ کے قیام سے بہت پہلے مولانا نے پٹنہ کے ایک جلسۂ عام میں جو خطبۂ صدارت اس موضوع پر ارشاد کیا تھا وہ آج بھی ایک تاریخی دستاویز ہے۔ اور اس سے بہتر اظہار خیال کسی اور نے نہیں کیا ہے۔ اس میں مولانا نے ہی پہلی بار یہ تجویز پیش کی کہ مسلم پرسنل لا کے تحفظ کی ضمانت اسی وقت مل سکتی ہے جب دستور ہند سے یکساں سول کوڈ کے رہنما اصول کو خارج کر دیا جائے۔ ان کے اس قانونی نکتے نے شروع سے آخر تک مسلم پرسنل لا تحریک کو روشنی دکھائی اور اس کی ذہنی رہنمائی کی گرچہ اس کا مقصد ابھی تک حاصل نہیں ہوا۔

مولانا کی تقریر کا انداز بھی ان کی تحریر ہی کی طرح دھیما، سلجھا ہوا غیر جذباتی، فکری اور منطقی ہوا کرتا تھا شاید جوش میں وہ کبھی نہ کچھ لکھتے تھے نہ بولتے تھے۔ ان کی تحریر، اور گفتگو میں زور خطابت پر نہیں فراست پر ہوا کرتا تھا۔ وہ بہت ہی ٹھنڈے ذہن اور مزاج کے انسان تھے اپنی بات مختصر کر کے صاف صاف ایک تدریج وترتیب کے ساتھ کرتے تھے۔ نظم وضبط صبر وتحمل اور تفکر ان کی زندگی کے ہر پہلو کی خاص ادائیں تھیں۔ ان کی شخصیت میں صبر وشکر اور ایثار وقربانی کے اوصاف سب سے نمایاں تھے گرچہ وہ بہت سیدھے سادے انداز سے ملاقات اور بات کرتے تھے مگر ان کی متانت ملنے والے پر اثر ڈالتی تھی۔ وہ ہر معاملے کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کر کے بہت ہی محتاط اور معتدل طریقے سے اپنا موقف پیش کرتے تھے۔ توازن اور احتیاط مولانا کے کردار کی بنیادی صفات تھیں۔

۱۹۴۷ء میں جب برصغیر تقسیم ہوا تو اس وقت کی غیر منقسم جماعت اسلامی کے صرف ایک قائد اور امیر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی تھے۔ وہی جماعت کے داعی، بانی، مفکر اور منتظم تھے ان کی ہی تصانیف جماعت اسلامی کا لٹریچر تھیں۔ لہٰذا تقسیم کے وقت ہندوستان میں رہ جانے والے ارکان جماعت کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ امارت وقیادت کا تھا اس وقت ملک وملت اور جماعت سب ایک بحران سے دوچار تھے مسلمانوں کا انتشار نقطۂ عروج پر تھا۔ ان کی کوئی تنظیم سلامت اور فعال نہیں تھی۔ ایک تذبذب، بے عملی اور مایوسی کی کیفیت عوام وخواص پر طاری تھی کہ صرف ایک مولانا ابوالکلام آزاد کی ذات قائد کی حیثیت سے نمایاں تھی۔ لیکن ان کے تحت کوئی ملی تنظیم نہیں تھی۔ گرچہ سب سے بڑی قومی تنظیم کے وہ ایک مستقر قائد تھے۔ اور کانگریس کی صدارت وہ ایک طویل مدت تک کر چکے تھے۔

اس صورت حال میں مولانا ابواللیث صاحب کا انتخاب امیر جماعت اسلامی ہند کی حیثیت سے ہوا۔

جبکہ جماعت کی تنظیم کا شیرازہ بکھر چکا تھا چنانچہ مولانا نے جماعت کی قیادت و تنظیم کا کام گویا صفر سے شروع کیا اور ان کے پاس مولانا مودودی کے لٹریچر کے سوا کوئی اثاثہ آزاد ہندوستان میں تحریک اسلامی کو آگے بڑھانے کے لئے میسر نہیں تھا اس وقت جماعت کے سامنے اپنے مرکز سے کر شاخوں تک کے قیام کا مسئلہ تھا ملک کی فرقہ وارانہ فضا میں اسلام اور مسلمانوں کی صحیح تصویر پیش کرنے کی مہم بھی درپیش تھی۔

مولانا ابواللیث صاحب نے ان سب مشکلات کا مقابلہ جس ہمت، تدبر اور سلیقے سے کیا اس سے ان کی سیرت اور جماعت کی حقیقت دونوں آشکارا ہوئی اقامت دین کی راہ میں ان کی استقامت ہی نے آج جماعت اسلامی ہند کو ملک میں مسلمانوں کی سب سے بڑی تنظیم بنا دیا ہے مختلف مواقع پر جماعت کے خلاف فرقہ پرستی، قدامت پرستی بلکہ کشمیر کے حوالے سے دہشت پسندی تک کے الزامات لگائے گئے ہیں۔ اور قوم پرستوں نے اس کا قافیہ عسکریت پسند راشٹریہ سویم سیوک سنگھ تک کے ساتھ ملا دیا۔ لیکن بار بار کی سرکاری تحقیق و تفتیش کے بعد یہ ثابت نہیں ہو سکا کہ جماعت اسلامی نے تشدد تو دور کی بات ہے فرقہ وارانہ منافرت پھیلانے کی کوشش بھی کی ہے درحقیقت جارحیت جماعت کے نصب العین کے خلاف ہے جہاں تک جماعت اسلامی کشمیر کا تعلق ہے، فی الواقع اس کا کوئی تنظیمی رشتہ جماعت اسلامی ہند کے ساتھ نہیں ہے تقسیم ہند کے بعد ہی کشمیر کی جماعت نے اپنی الگ بساط بچھائی۔ جماعت اسلامی پاکستان سے بھی جماعت اسلامی کا تنظیمی تعلق آزادی کے بعد باقی نہیں رہا۔ ہندوستان کے مخصوص حالات میں جماعت اسلامی ہند نے ایک مخصوص اور مستقل بالذات طریق کار اختیار کیا ہے جس میں اسلام کے دو بنیادی اصول وحدت انسانی اور خدمت خلق سب سے نمایاں عناصر ہیں یقیناً انسانی اخوت کے حسن تصویر تحریک اسلامی کا رہنما وہ اسلامی نظریہ زندگی اور نظام حیات پر مبنی ہے لیکن جماعت اسلامی ہند ملک کی ترقی کے لئے اسلام کے فلاحی و رفاہی نظریات کے مطابق کوشاں ہے۔ اس لئے جماعت نے بعض اوقات ہندو تنظیموں کے ساتھ بھی اخلاقی مفاہمت کے لئے گفت و شنید کی ہے۔

جماعت اسلامی ہند کا یہ طرز عمل مولانا ابواللیث صاحب کے زیر قیادت رونما ہوا اس طرح ان کی امارت میں جماعت نے ایک طرف ملی اتحاد و اتفاق کے لئے ہر قسم کی سعی کی اور دوسری طرف ملکی سالمیت اور قومی یکجہتی کے فروغ میں بھی اپنے نظریے اور طریقے کے مطابق حصہ لیا۔ حالات کی پیچیدگی اور نزاکت بلکہ خطرناکی و شدت کو دیکھتے ہوئے اس نظریے اور طریقے پر کاربند رہنا کوئی آسان کام

نہیں تھا۔ کئی بار جماعت کے ارکان گرفتار کئے گئے۔ بعض وقت جماعت پر پابندی بھی لگی۔ سیاسی رہنماؤں اور صحافیوں نے جماعت پر طرح طرح کے الزامات بھی لگائے۔ مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کی مخالفتوں کا سامنا جماعت کو کرنا پڑا اور خود مسلمان اسلامی نظریہ حیات سے بالعموم بیگانہ ہو گئے۔ ان سب باتوں کے باوجود ایک نہایت ناسازگار ماحول میں جماعت اسلامی ہند نے مولانا ابواللیث صاحب کے زیر امارت اپنا فکری و عملی توازن برقرار رکھا، عام مسلمانوں اور غیر مسلموں کی بہی خواہی اور خدمت گزاری کی روش پر قائم رہی اور اپنے اصولی موقف سے کبھی ہٹی نہیں۔ یہاں تک کہ آج ملک کی ایک اہم تنظیم کی حیثیت سے اس کی شناخت واضح ہے۔ یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں۔

جماعت نے مولانا مرحوم کے زیر قیادت فسادات، قحط، سیلاب وغیرہ کے نازک مواقع پر خلق خدا کی راحت کے لئے جو عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں وہ بجائے خود اس بات کا ثبوت ہیں کہ مولانا کے زیر امارت جماعت کی قیادت کا کیا رنگ و آہنگ رہا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا کے اقدامات سے ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے کردار کی بہترین ترجمانی ہوئی ہے اور یہ حقیقت واضح ہوئی ہے کہ دین اسلام انسانی و آفاقی قدروں کا حامل ایک ایسا نظریہ ہے جس میں رحمت و برکت کا تصور خود اور سماج کی زندگی کی تمام جہتوں پر محیط ہے۔

مولانا کے زیر قیادت جماعت ایک طویل مدت تک ملک کی پارلیمانی سیاست سے بالکل الگ رہی ہے ہے لیکن کچھ دنوں قبل ارکان جماعت کو ووٹ کی اجازت دی گئی پھر یہ ہدایت بھی کی گئی کہ انتخابات میں صالح امیدواروں کی حمایت کی جائے۔ یہ گویا جمہوری و عوامی سیاست میں جماعت کا پہلا قدم ہے جو مولانا ہی کے دور امارت میں اٹھایا گیا۔ اگرچہ ایمرجنسی کے فوراً بعد کے انتخابات میں بھی ہنگامی طور پر ارکان جماعت کو جمہوریت کی بقا کے لئے کام کرنے کی اجازت و ہدایت دی گئی تھی۔ بہرحال حالات کے تقاضوں کو دیکھتے ہوئے مولانا ابواللیث صاحب نے جماعت کو آئندہ اقدامات کی راہ بھی دکھا دی اور یہ اشارہ بھی کر دیا کہ وہ ہندوستان میں تحریک اسلامی کو کس رخ پر آگے بڑھانا چاہتے ہیں۔

بیاد مولانا ابواللیث صاحب اصلاحی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

بے بوریا اداس کہ سلطاں چلا گیا

حکیم محمد ایوب صاحب، بلریا گنج، اعظم گڑھ

وہ جو سکونِ قلبِ پریشاں چلا گیا
تڑپے ہے درد، درد کا درماں چلا گیا

نم ناک نگاہوں نے کیا آخری سلام
خندہ بلب وہ شاد و فرحاں چلا گیا

ہم عصر ساتھیوں میں وہ ممتاز و بے مثال
بچے اداس، نازشِ طفلاں چلا گیا

اک شاخِ سایہ دار کی گنجشک ہیں حیراں
اک صاحبِ عزیمت و ایماں چلا گیا

وہ اپنی سلطنت کا اک شاہِ گدا نما
فوج و سپاہ جس پہ تھی نازاں چلا گیا

نانِ جویں کو ناز تھا جس پر نہیں رہا
بے بوریا اداس کہ سلطاں چلا گیا

مولانا ابواللیث اصلاحی ندویؒ کی علمی خدمات

عبدالبر اثری فلاحی

مولانا ابواللیث اصلاحی ندویؒ کی زندگی پر اب تک جتنے لوگوں نے قلم اٹھایا ہے انھوں نے یا تو مولانا کے علمی خدمات کے گوشے کو نظرانداز کر دیا ہے یا پھر بڑی حد تک تشنہ چھوڑ دیا ہے حالانکہ مولانا کی زندگی کا یہ گوشہ بہت ہی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ مولانا کی ابتدائی زندگی کے احوال کو معلوم کرنے سے ایسا پتہ چلتا ہے کہ دراصل مولانا کا اصلی میدان تصنیف و تعلیم ہی تھا بطور خاص قرآن کی تعلیم و اشاعت، گرچہ بعد میں حالات کے تقاضے کے تحت آپ کو اپنا میدان بدلنا پڑا یعنی تصنیف و تالیف اور تعلیم و تعلم کو چھوڑ کر قیادت و رہنمائی کے میدان میں آنا پڑا پھر بھی ابتداءً جو خدمات آپ نے اپنی مختصر تعلیمی و تصنیفی زندگی میں انجام دیں وہ قابل رشک اور ہر طالب علم دین کے لئے قابل نمونہ ہیں۔

میں یہ چاہتا ہوں کہ مولانا کی علمی خدمات کا ایک مختصر خاکہ آپ کے سامنے آجائے تاکہ مولانا کی زندگی کا یہ مخفی گوشہ نمایاں ہو جائے اور اس لئے بھی کہ مولانا کے الرفیق الاعلیٰ سے جا ملنے کے بعد اب ان کا علمی سرمایہ ہی وہ چیز ہے جس کے ذریعہ ہم رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں اور جس سے استفادہ کرکے ہم ان کے لئے بلندی درجات کا سبب بن سکتے ہیں۔

باوجود بسیار کوشش کے اس سلسلے کی تمام معلومات تو میں حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا البتہ جس قدر میسر آسکا ہے پیش خدمت ہے۔

مولانا پڑھنے اور سمجھنے کی حد تک عربی، اردو، انگریزی اور ہندی سبھی زبان سے واقف تھے البتہ آپ کی تحریریں صرف عربی اور اردو زبان میں ہیں۔

عربی مضامین: عربی تعلیم ابتداء میں مولانا نے مدرستہ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ میں حاصل کی پھر ندوۃ العلماء لکھنؤ گئے اور وہاں سے فراغت کے بعد وہیں استاذ ہو گئے

اسی زمانہ میں "الضیاء" نامی ایک ماہانہ عربی علمی، ادبی مجلہ جاری ہوا جو مولانا سید سلیمان ندویؒ اور مولانا تقی الدین ہلالیؒ کے زیر نگرانی نکلتا تھا البتہ اس کے ایڈیٹر مولانا مسعود عالم ندویؒ تھے اس میں مولانا کے حسب ذیل مضامین شائع ہوئے۔

۱۔ السلطان تیپو — اگست ۱۹۳۲ء ج ۱ ش ۴ صفحہ ۲۲-۲۸

۲۔ علم الحدیث فی الہند (۱) اگست ۱۹۳۳ء ج ۲ ش ۴ ص ـــــ

〃 (۲) ستمبر 〃 〃 ۵ ص ۱۸۱-۱۶۲

〃 (۳) اکتوبر 〃 〃 ۶ ص ـــــ

〃 (۴) نومبر 〃 〃 ۷ ص ۲۴۵-۲۲۳

〃 (۵) دسمبر 〃 〃 ۹ ص ۲۸۹-۲۶۲

(یہ سلسلہ مضامین دراصل مولانا سید سلیمان ندوی کے اردو مضمون "ہندوستان میں علم حدیث" کا عربی ترجمہ ہے)

۳۔ الامام حمید الدین الفراہی نومبر ۱۹۳۳ء ج ۲ ش ۷ ص ۲۶۰-۲۵۳

۴۔ الشاہ ولی اللہ الدہلوی اکتوبر و نومبر ۱۹۳۳ ج ۳ ش ۷، ۸ ص ۲۶۰-۲۵۲

۵۔ الالتفات دسمبر ۱۹۳۴ء و جنوری ۱۹۳۵ء ج ۳ ش ۹، ۱۰ ص ۳۳۲-۳۲۹

۶۔ قصۃ یوسف علیہ السلام فی التوراۃ والانجیل (۱) اگست ۱۹۳۵ء ج ۴ ش ۵ ص ۱۸۵-۱۶۸

〃 (۲) ستمبر ج ۴ ۶ ص ۲۱۴-۲۰۶

〃 (۳) اکتوبر ج ۴ ۷ ص ۲۴۶-۲۴۲

۷۔ ابھی چند سالوں پہلے دار المصنفین اعظم گڑھ کی جانب سے "اسلام اور مستشرقین" کے عنوان پر ایک عالمی سیمینار ہوا تھا اس میں مولانا نے اپنا مقالہ عربی ہی میں لکھا تھا جس کا ترجمہ مولانا عبید اللہ کوٹی ندوی رفیق دار المصنفین کے قلم سے "اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر ایک سرسری نظر" کے عنوان سے "اسلام اور مستشرقین" جلد نمبر ۲ ص ۲۶۳-۲۴۶ میں شائع ہو چکا ہے۔

اردو تصنیفات و کتابچے :

۱۔ مسئلہ انتخابات اور مسلمانان ہند

۲۔ مسلمانان ہند کا لائحہ عمل (دراصل یہ "مسئلہ انتخابات اور مسلمانان ہند" کا دوسرا حصہ ہے جو اس نام سے شائع ہوا ہے)

۳۔ امیر جماعت کی مولانا سید احمد مدنی سے مراسلت

۴۔ جماعت اسلامی کا مقصد اور طریقہ کار

۵۔ دعوت اسلامی ہندوستان میں

۶۔ مغرب میں اسلام کی دعوت

۷۔ جماعت اسلامی ہند حقائق و الزامات

۸۔ حالات حاضرہ اور ہماری ذمہ داریاں

۹۔ ہندوستان کا مستقبل اور جماعت اسلامی کی دعوت

۱۰۔ ملک و ملت کے مسائل اور ان کا حل

۱۱۔ ملک و ملت کے چند قابل توجہ مسائل

۱۲۔ الیکشن اور مسلمان

۱۳۔ نشہ بندی اور اسلام

۱۴۔ تشکیل جماعت اسلامی ہند کیوں اور کیسے

۱۵۔ ملک و ملت کے مسائل اور مسلمانوں کی ذمہ داریاں

۱۶۔ بھارت کی تعمیر نو اور ہم (یہی کتاب "بھارت کا نو نرماڑ تتھا ہم" کے نام سے ہندی میں بھی شائع ہو چکی ہے۔

۱۷۔ روداد کار تقریریں۔

مندرجہ بالا تمام کتب مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی نمبر ۶ سے شائع ہو چکی ہیں اور دستیاب ہیں۔

ایک کتاب جو شائع نہیں کرائی :

۱۹۷۵ء تا ۱۹۷۷ء جبکہ مولانا امارت سے سبکدوش ہو کر اپنے گھر پر مقیم تھے ان دنوں انھوں نے شیخ محمد غزالی کی کتاب "عقیدۃ المسلم" کا ترجمہ کیا تھا لیکن محض ایثار اور بے لوثی کی وجہ سے شائع نہیں کرائی چونکہ اس کے پیچھے ایک کہانی ہے اس وجہ سے اس کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ احتیاط کی غرض سے صاحب واقعہ مولانا عنایت اللہ صاحب سبحانی کی زبانی نقل کر رہا ہوں بقیہ تفصیل کا اندازہ اسی سے ہو جائے گا یہ واقعہ مولانا نے ۸ دسمبر ۱۹۹۰ء کو جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڑھ میں ہوئے تعزیتی جلسے میں سنایا تھا۔

"یہ چیز سمجھی جاتی ہیں کہ مولانا کے اندر بڑی ہی بے لوثی اور بڑی ہی بے نفسی تھی اور بڑی عجب بے نفسی کے ساتھ انھوں نے جماعت کے لئے اپنی جوانی اور جوانی کی توانائیاں تج دیں اور پوری زندگی اس کیلئے لگا دی لیکن خود میرے ساتھ ایک واقعہ جو پیش آیا اس کو آج بھی یاد کر کے رات بھر روتا رہا اور میرے آنسو رک نہیں رہے تھے۔ جب مولانا امارت سے سبکدوش ہو کر کے چاند پٹی آ گئے تھے پہلی بار تو اس وقت مولانا کے پاس ... کوئی ذریعہ معاش نہیں تھا مرکز کے لوگ یہ چاہتے تھے کہ کسی طرح سے ان کی خدمت کی جائے اور ان کے لئے آسانی فراہم کی جائے لیکن مولانا کی خودداری اس کے لئے تیار نہ ہوتی تھی کہ جب کر وہ وہاں سے چلے آئے ہیں تو وہاں سے کوئی رقم لیں۔ قیم جماعت مولانا افضل حسین صاحب مرحوم نے اس کی یہ شکل نکالی کہ ان سے یہ کہا کہ آپ تصنیفی کام کیجئے یا کسی عربی کتاب کا ترجمہ کر ڈالئے اور اس محنت سے جو حاصل ہو اسے لیجئے اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ایسے لینا مناسب نہیں چنانچہ مولانا نے اس چیز کو پسند کیا اور اس تجویز کو انھوں نے قبول کر لیا انھوں نے ایک کتاب شیخ محمد غزالی کی کتاب "عقیدۃ المسلم" کا ترجمہ کرنا شروع کیا اور اسے پورا کر ڈالا مجھ کو معلوم نہیں تھا اتفاق کی بات کہ میں نے بھی اپنے طور پر اس کتاب کا انتخاب کیا اس لئے کہ مولانا جلیل احسن صاحب مرحوم اس کی بڑی تعریف کیا کرتے تھے اور وہ یہ بھی فرمایا کرتے تھے مولانا ابو اللیث صاحب مرحوم کے حوالے سے کہ وہ بھی اس کتاب کو پسند کرتے ہیں اور چاہتے تھے کہ ترجمہ ہو جائے تو پہلی بار جبکہ میں ۱۹۶۹ء میں جامعۃ الفلاح سے علیحدہ ہو کر کے اپنے گھر پر بیٹھ رہا تھا تو اس فراغت کے زمانے میں میں نے سوچا کہ "عقیدۃ المسلم" کا ترجمہ کر ڈالوں اس لئے کہ جب سے میں نے یہ سنا تھا کہ یہ لوگ اس کے خواہاں ہیں تو میں نے یہ طے کر لیا تھا کہ میں فرصت کے وقت اسے ضرور کروں گا چنانچہ خود مولانا نے اس کا ترجمہ کیا اور میں نے الگ اس کتاب کا ترجمہ کیا جب کتاب کا مسودہ لے کر کے میں مرکز گیا مرکزی مکتبہ کو دینے کے لئے تو مولانا افضل حسین صاحب نے یہ فرمایا کہ اس کا ترجمہ تو مولانا نے کر ڈالا تو میں نے کہا کہ میں اپنا ترجمہ روک لیتا ہوں مولانا کا ترجمہ شائع ہونا چاہئے مولانا کو کسی ذریعے سے معلوم ہو گیا کہ میں نے اس کا ترجمہ کیا ہے تو وہ اس پہ مصر ہوئے کہ نہیں اگر اس نے ترجمہ کیا ہے تو اس کا ترجمہ شائع ہو میرا ترجمہ نہیں شائع ہوگا میں نے یہ کہا کہ نہیں میں اپنا نہیں شائع کروں گا اور لوگوں نے بھی کہا کہ نہیں آپ کا ترجمہ آ جائے گا تو لوگوں کو زیادہ پسند ہوگا اور آپ کی شخصیت کے لحاظ سے اس کی قیمت ہوگی اور اس کی اہمیت ہوگی مولانا نے کہا

کہ نہیں میرا ذاتی مسئلہ نہیں ہے لیکن اس نوجوان کی دل شکنی ہوگی اس نوجوان نے محنت کی ہے اس نوجوان کی محنت کی قدر ضروری ہے اس کا ترجمہ شائع ہونا چاہیے چنانچہ کسی قیمت پر مولانا تیار نہیں ہو رہے تھے اور میں بھی تقریباً دو سال تک رکا رہا اور شائع نہیں کرایا یہاں تک کہ جب مایوسی ہوگئی تو اس وقت میں نے اس کو شائع کرایا اور مولانا کی کتاب اب تک شائع نہیں ہوئی۔"

اردو مضامین: ۱۹۳۶ء میں مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے مدرسۃ الاصلاح سے تعلیم قرآن اور فکر فراہیؒ کی ترویج کے لئے "الاصلاح" کے نام سے ایک ماہانہ رسالہ نکالنا شروع کیا جب تک مولانا مدرسۃ الاصلاح میں رہے برابر اس میں مولانا کے مضامین چھپتے رہے اور عام طور سے وہ مضامین قرآنی موضوعات پر ہوتے تھے ان کے مطالعہ کے بعد میں بجا طور پر یہ کہنے کا حق رکھتا ہوں کہ مولانا فراہیؒ کے چھوڑے ہوئے خاکہ میں رنگ بھرنے میں مولانا کا بھی حصہ ہے اس رسالے میں چھپے ہوئے مضامین کی فہرست درج ذیل ہے۔

۱۔	ولایات متحدہ امریکہ اور علوم شرقیہ (تلخیص)	جنوری ۱۹۳۶ء	ج ۱	ش ۱	ص ۶۴-۶۳
۲۔	قرآن اور ترتیب اسماء انبیاء کرام	فروری "	"	۲	ص ۴۳-۲۶
۳۔	قرآن میں تکرار کی نوعیت اور قصہ آدم و شیطان (۱)	مارچ "	"	۳	ص ۲۲-۱۶
	" (۲)	اپریل "	"	۴	ص ۳۱-۲۲
	" (۳)	مئی "	"	۵	ص ۳۷-۲۴
۴۔	سورہ ہود کے متعلق ایک اہم سوال کا جواب	مارچ ۱۹۳۶ء	ج ۱	ش ۳	ص ۳۲-۲۵
۵۔	علمائے یورپ کا معیار بحث و نظر (تلخیص)	"	"	"	ص ۶۳-۶۰
۶۔	انگریزی شہنشاہیت کے استحکام کا راز	اپریل ۱۹۳۶ء	ج ۱	ش ۴	ص ۶۴-۶۱
۷۔	علم امتحان کی کسوٹی پر (تلخیص)	مئی ۱۹۳۶ء	ج ۱	ش ۵	ص ۶۰-۵۵
۸۔	لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں	مئی ۱۹۳۶ء	"	"	"
۹۔	تقریظ و تبصرہ (الزہراوات، ایمان سرور دو، بلاغ ماہوار)	"	"	"	ص ۶۴-۶۱
۱۰۔	قرآن مجید اور ربع	جون ۱۹۳۶ء	"	۶	ص ۳۷-۲۳
۱۱۔	ہماری سب سے اہم ضرورت	مارچ و اپریل ۱۹۳۹ء	ج ۴	ش ۳، ۴	ص ۵۷-۲۵

١٢ ـ فرصت کی گھڑیاں جنوری ۱۹۳۶ء ج ۳ ش ۱ ص ۳۹-۴۰

١٣ ـ جنگ (کیا دنیا سے کبھی اس کا خاتمہ ہو سکتا ہے) نومبر ۱۹۳۹ء ج ۴ ش ۱۱ ص ۲۶-۳۷
(علامہ جرجی زیدان کے مضمون کا عربی سے اردو میں ترجمہ)

اس کے بعد پھر آپ "فاران" بجنور کے ایڈیٹر ہوئے تو لکھنا لکھانا مستقل آپ کا اوڑھنا بچھونا ہی ہو گیا چنانچہ آپ نے اپنی ادارت میں اسے خوب ترقی دی اور اس کے لئے وہ اصول رہنما قائم کیا جس سے آج کے رسالے عام طور سے کورے نظر آتے ہیں تحقیق حال اور اسوہ بنانے کے لئے اسے نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے ماہ نومبر ۱۹۳۶ء کے صفحہ ۲ پر "فاران کے لئے مضامین" کی سرخی کے تحت لکھتے ہیں۔

١ ـ مذہبی مضامین جو فاران کے معیار کے مطابق ہوں
٢ ـ تاریخی مضامین جو عام فہم، مستند اور نتیجہ خیز ہوں
٣ ـ خواتین کے متعلق اصلاحی مضامین
٤ ـ الحاد، دہریت اور رنگین خیالات پر سنجیدہ مقالات
٥ ـ علوم جدیدہ اور انکشافات حاضرہ پر تبصرے
٦ ـ مذاہب عالم پر تحقیقی اور تنقیدی نظر
٧ ـ مفاد عامہ کے پیش نظر صحت عامہ اور طریقہائے علاج
٨ ـ ادب و اخلاق اور ذہنی تربیت کے متعلق مفید تجاویز
٩ ـ اسلامی اور غیر اسلامی سیاسیات کا تقابل
١٠ ـ معاشیات اور اقتصادیات
١١ ـ بلند معیار کی نظمیں اور غزلیں

ہر مضمون ٹھوس اور سنجیدہ ہونا چاہیئے اور شخصی مباحث سے پرہیز کرنا چاہیئے ورنہ اس قسم کے مضمون فاران میں شائع نہ ہو سکیں گے۔

مضامین میں اختصار اور جامعیت کو مد نظر رکھنا ضروری ہے ایڈیٹر کو حذف و ترمیم اور اضافہ کا اختیار رہے گا۔

"مدیر فاران"

اس میں شذرات کے علاوہ آپ نے درج ذیل عناوین پر قلم اٹھایا تھا۔

١ ـ تبلیغ اسلام (١) جولائی ۱۹۳۶ء ج ۲ ش ۷ ص ۵-۹
" (۲) اگست " " ۸ ص ۴-۹
٢ ـ سورہ حجر کے متعلق ایک استفسار کا جواب جولائی ۱۹۳۶ء " ش ۷ ص ۵۲-۵۵
٣ ـ فتنۂ تکفیر (سید سلیمان ندویؒ اور فراہیؒ پر کفر کے فتوے کی تردید میں)
اگست ۱۹۳۶ء ج ۲ ش ۸ ص ۱۰-۱۸
٤ ـ سوال و جواب " " " ص ۵۴-۵۶
٥ ـ توحید کے اثرات (١) ستمبر ۱۹۳۶ء " ۹ ص ۵-۹
" (۲) اکتوبر " ۱۰ ص ۵-۹
" (۳) نومبر " ۱۱ ص ۵-۹

اس میں کچھ مستقل کالم بھی تھے جیسے دلچسپ معلومات، کوائف عالم اسلامی، مطبوعات جدیدہ تقریظ و تبصرہ، عربی مضامین کا ترجمہ وغیرہ بطور خاص علامہ سید رشید رضا مصریؒ کی تفسیر "المنار" کا شروع سے ترجمہ شائع ہو رہا تھا یہ تمام کالم ادارہ کے تحت لکھا جاتا تھا اور میرا گمان غالب یہ ہے کہ ان تمام کو مولانا ہی تیار کرتے اور ترتیب دیتے تھے واللہ اعلم بالصواب

اس زمانہ کے مشہور قوم پرور سہ روزہ اخبار "مدینہ" بجنور میں بھی برابر آپ لکھتے رہتے تھے بلکہ اس کی ادارت میں بھی شریک تھے لیکن اس کی فائلیں دستیاب نہ ہو سکیں صرف ایک جوبلی نمبر ۱۹۳۹ء ج ۲۸ ش ۲۹ نظر سے گذرا لیکن اس میں آپ کا کوئی مضمون نہیں آیا تھا البتہ پہلے ہی صفحہ پر مجلس ادارت کے تحت لکھا تھا

مسئول : ابو سعید بزمی ایم، اے
حمید حسن فکر
ابو اللیث اصلاحی ندوی

مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کے پٹھان کوٹ منتقل ہو جانے کے بعد "الاصلاح" تو مدرسۃ الاصلاح سے نکلنا بند ہو گیا البتہ بعد میں "اصلاح" کے نام سے سہ ماہی رسالہ کی شکل میں

مولانا کی زیر ادارت نکلنا شروع ہوا لیکن صرف سال بھر جاری رہ سکا یعنی صرف ۳ شمارے جنوری ۱۹۴۱ء تا دسمبر ۱۹۴۱ء پر مشتمل ہی منظرِ عام پر آسکے، بدقسمتی سے اس کا صرف ایک ہی شمارہ مجھے دستیاب ہوسکا جس میں خدمات مدرسہ کے احوال کے علاوہ صرف ایک مضمون بعنوان "توحید کی حقیقت" نظر آیا یہ مضمون اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۴۱ء کے ج ۱ ش ۳ میں موجود ہے۔

مولانا ابو الاعلیٰ مودودیؒ نے حیدرآباد دکن سے جب ماہنامہ "ترجمان القرآن" نکالنا شروع کیا تو اس میں بھی آپ کے کئی مضامین چھپے ناقص حاصل شدہ معلومات حسب ذیل ہے۔

۱۔ قصۂ یوسف توریت اور قرآن کا موازنہ (۱) (یہ دراصل "الضیاء" ندوۃ العلماء میں چھپے عربی مضمون کا ترجمہ ہے) ربیع الثانی ۱۳۵۶ھ ج ۹ ش ۴ ص ۲۶۶-۲۷۹

(۲) جمادی الاولیٰ " " ۵ ص ۳۲۲-۳۵۶

۲۔ تفسیر سورۃ، تفسیل علامہ حمید الدین فراہیؒ (تقریظ و انتقاد) جمادی الآخری ۱۳۵۶ھ ج ۹ ش ۶ ص ۴۶۳-۴۶۴

۳۔ قوموں کی ہلاکت کا سبب (بنی اسرائیل کی ایک آیت "اذا اردنا ... ففسقوا فیھا" کی تحقیق) شعبان ۱۳۵۶ھ ج ۱۰ ش ۲ ص ۱۲۱-۱۲۷

ان کے علاوہ مختلف مواقع پر خطبات صدارت، مقالات، سوالات کے جوابات، اعتراضات کے جوابات اور روداد وغیرہ کرتے رہے وہ تمام چیزیں یا تو مختلف کتابچوں کی شکل میں شائع ہوچکی ہیں یا روداد جماعت اسلامی ہند کے اندر چھپ چکی ہیں یا سہ روزہ "الانصاف" الہ آباد، سہ روزہ "دعوت" دہلی، ماہنامہ "زندگی" رامپور (جواب "زندگی نو" کے نام سے علی گڑھ سے شائع ہورہا ہے) وغیرہ اخبارات و رسائل میں شائع ہوتی رہی ہیں اور ان سے لوگ برابر استفادہ کرتے رہے ہیں اور اب بھی کر رہے ہیں اس لئے ان کی فہرست دینا مناسب نہیں معلوم ہوتا کیونکہ یہ تحصیل حاصل کے مترادف ہوگا۔

تدریس: آپ کے علمی خدمات کا ایک نمایاں پہلو یہ بھی ہے کہ آپ نے ملک کی دو عظیم درسگاہ "ندوۃ العلماء" لکھنؤ اور مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ میں تدریس کی خدمت بھی انجام دی ہے، کچھ دنوں اگر دربار سہارنپور میں غالباً مدرسہ "ضیاء العلوم" میں بھی مسند درس پر متمکن رہے۔

"ندوۃ العلماء" اور "ضیاء العلوم" میں کون سے مضامین آپ کے ذمے تھے یہ تو معلوم نہ ہوسکا البتہ "مدرسۃ الاصلاح" میں آپ "دلائل الاعجاز" کا درس دیتے تھے بعد میں اس کی جگہ مولانا فراہیؒ کی

کتاب "جمہرۃ البلاغۃ" داخل نصاب ہوئی تو اس کا بھی درس آپ نے دیا ہی "مدرسۃ الاصلاح" میں حدیث، فقہ اور ادب بھی آپ پڑھاتے تھے حدیث میں "الجامع الصحیح للبخاری" "الجامع الترمذی" اور فقہ میں "بدایۃ المجتہد" آپ کے ذمے تھی۔

بعض ذرائع سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب جماعت کا مرکز رامپور میں تھا تو ان دنوں آپ وہاں "حجۃ اللہ البالغہ" کا درس بھی دیتے تھے۔

نظامت و انتظام: آپ کی علمی خدمات کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ آپ تقریباً دو سال جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڈھ کے ناظم بھی رہ چکے ہیں اپنے دور نظامت اور اپنے دور امارت دونوں ہی میں جب بھی وہ جامعۃ الفلاح تشریف لاتے تو طلبہ کے پروگرام ہوتے انھیں مختلف ہدایات و رہنمائی دیتے اور تقریباً ہر مرتبہ اساتذہ کرام کی خصوصی مجلسیں ہوتیں جس میں وہ دیگر امور کے ساتھ ان کی مشکلات سنتے اور حل کی تدابیر بتاتے اس طرح کی بعض مجلسوں میں شرکت کا خود مجھے بھی شرف حاصل ہے یہ چیز صرف یہیں تک محدود نہیں تھی بلکہ ملک کے دیگر بڑے بڑے اداروں تک پھیلی ہوئی تھیں کیونکہ جامعۃ الفلاح کی مجلس انتظامیہ و مجلس تعلیمی کے مستقل ممبر ہونے کے علاوہ ندوۃ العلماء لکھنؤ، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، مرکزی درسگاہ رامپور، جامعۃ الصالحات رامپور، دینی تعلیمی کونسل اترپردیش وغیرہ کے بھی مستقل رکن انتظامی رہے تھے۔

جاری کام جو نامکمل رہا: اس بار جب مولانا امارت سے سبکدوش ہوکر گھر تشریف لائے تو پھر کچھ لکھنے پڑھنے کا کام شروع کیا تھا اور وہ کام جاری تھا اس کام میں چونکہ مولانا نظام الدین صاحب اصلاحی بھی معاونت کررہے تھے اس لئے انھوں نے بتایا کہ جو کتاب زیر ترتیب تھی گرچہ مولانا نے اس کا نام تجویز نہیں کیا تھا لیکن میرا خیال یہ ہے کہ اگر اسے نام دیا جائے تو اسے "مولانا ابواللیث کی سوانح عمری مکاتیب کی روشنی میں" نام دیا جائے گا یا دیا جانا چاہئے انھوں نے بتایا کہ تقریباً ۸۰ صفحے تبییض و تسوید کے بعد کتابت کے لئے بھیجے جاچکے تھے بقیہ کی تیاری چل رہی تھی انھوں نے یہ بھی بتایا کہ اس میں بہت کام اور اہم باتیں تھیں کبھی کبھی جب میں تعجب سے پوچھتا کہ اچھا یہ بھی ہے تو مولانا فرماتے کہ "یہ کیا ہے ابھی اس سے بھی زیادہ اہم اور تعجب خیز باتیں آگے آئیں گی"۔

بہر صورت یہ ساری چیزیں امانت ہیں جسے لوگوں تک پہنچنا چاہئے شاید اسی احساس کی بنیاد پر

مولانا اسے ترتیب دے رہے تھے تاکہ اسے لوگوں تک پہنچا دیا جائے اب جبکہ مولانا نہیں رہے اور ان کے وارثین اس کے امین ہیں ان کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اسے لوگوں تک پہنچا دیں بطور خاص مولانا نظام الدین صاحب اصلاحی جو اس کام میں مولانا کی معاونت بھی کر رہے تھے اس کے مکلف ہیں۔

مولانا کا خواب جو پورا نہ ہو سکا ـــ تعبیر کے لئے افراد درکار ہیں

ذیل میں کچھ ایسے حوالے اور احوال کا تذکرہ کیا جا رہا ہے جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کے ذہن میں کچھ موضوعات پر لکھنے کا خاکہ تھا وہ ان پر لکھنا چاہتے تھے اور ان پر لکھنے کی ضرورت کو شدت سے محسوس کرتے تھے لیکن حالات اور زندگی نے وفا نہ کیا اور وہ سارے کام تشنہ رہ گئے لیکن چونکہ ان موضوعات پر مفصل و مدلل انداز میں لکھے جانے کی اس وقت بھی ضرورت ہے کیونکہ مولانا کے رخصت ہو جانے سے یہ ضرورت ختم نہیں ہو گئی ہے اس لئے اس تذکرے کا مقصود دراصل یہ ہے کہ کچھ اہل علم جرأت کر کے اس کام کا بیڑا اٹھائیں اور اس ضرورت کی تکمیل فرمائیں اگر ایسا کسی نے کیا تو میری سمجھ سے ایک طرف امت کی ضرورت بھی پوری ہو گی اور دوسری طرف مولانا کی روح کو راحت و سکون بھی حاصل ہو گا۔

۱۔ اپنے مضمون "قرآن میں تکرار کی نوعیت اور قصہ آدم و شیطان" کے آخر میں لکھتے ہیں کہ "میں نے ابتدائے مضمون میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ ان قصوں پر دو پہلوؤں سے غور کرنا ہے ایک ان کے ذکر اغراض کو متعین کرنا ہے دوسرے ان کے اسالیب بیان کا اختلاف اور اس کے وجوہ و مصالح ہیں لیکن پہلی ہی بحث نے مضمون کو اس قدر طویل بنا دیا کہ اس صحبت میں دوسرے پہلو پر بحث کرنا ناظرین پر شاق ہو گا۔

اس قصے کو اگر آپ ان ساتوں سورتوں میں ملاحظہ فرمائیں گے تو آپ کو نظر آئے گا کہ ہر سورہ کی عبارت اور اسلوب، ایک دوسرے سے مختلف ہے اس اختلاف کی وجہ ان کے مقاصد ذکر کا اختلاف ہے لیکن جب آپ ایک ایک ٹکڑے کو لے کر مقصد سے مطابقت دینے لگیں گے اور دوسری سورتوں سے مقابلہ کریں گے تو اس ضمن میں آپ کو بڑے بڑے حقائق نظر آئیں گے سورہ کہف میں "کان من الجن" کہنے کی توجیہ اور سورہ حجر میں، "حما مسنون" کی تصریح کی تعلیل میں اور بعض دوسری سورتوں میں جا بجا میں نے اختلاف اسلوب و عبارت اور اس کے وجوہ کی طرف اشارے کئے ہیں لیکن انشاء اللہ اس کے متعلق

اپنے خیالات ایک الگ عنوان "اسالیب القرآن" کے تحت مفصل بیان کروں گا (الاصلاح مئی ۱۹۳۶ء ص ۳۶)

۲۔ "علماء کا اس بارے میں سخت اختلاف ہے کہ ہندوستان میں خطبہ عربی زبان میں ہونا چاہئے یا اردو میں اس زمانہ میں عموماً علماء کا رجحان اس طرف ہے کہ خطبہ ہر ملک میں سننے والوں کی زبان میں ہونا چاہیے کیونکہ بغیر اس کے خطبہ کا اصلی مقصد یعنی تذکیر حاصل نہیں ہو سکتا لیکن بہت سے علماء اب تک چند قیاسی اور استنباطی دلائل کی بنا پر اسے بدعت قرار دیتے ہیں ہم انشاء اللہ آئندہ کسی فرصت میں اس مسئلہ پر مفصل بحث کریں گے (شذرات "فاران" بجنور اکتوبر ۱۹۳۶ء ص ۳)

۳۔ اگست ۱۹۳۲ء میں "الضیاء" ص ۲۳ کے اندر جب مولانا نے سلطان ٹیپو کی سیرت پر مضمون لکھا تھا تو اس وقت انھوں نے ابتدائی نوٹ کے اندر سبب تحریر بتاتے ہوئے لکھا تھا کہ "اصل عبارت عربی میں ہے اس کا خلاصہ اردو میں دیا جا رہا ہے" "جب سے میں نے عربی زبان سیکھی ہے اور عربی رسائل و جرائد خصوصاً مصر سے شائع ہونے والے مجلات پڑھنا شروع کیا ہے تو میں دیکھتا ہوں کہ ہندوستان اور یہاں کی اسلامی شخصیات کے بارے میں اوّل تو بہت کم خبریں ان مجلات میں چھپتی ہیں اور جو کچھ شائع ہوتا ہے وہ عام طور سے غلط اور ناقص چنانچہ میری خواہش ہے کہ ہند کی مشہور شخصیات پر جنھوں نے یہاں دعوت و جہاد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے، لکھوں، خاص طور سے ان لوگوں پر جن کے بارے انگریز مورخین نے لکھا ہے لیکن انھوں نے ان کی اصلی صورت بگاڑ کر پیش کی ہے اور بہت سی بے سر و پا باتیں گڑھ کر ان کی طرف منسوب کر دی ہیں"

چنانچہ "سلطان ٹیپو" پر اس مضمون کے علاوہ اس کے بعد کسی اور پر آپ کا کوئی مضمون نامعلوم اسباب کی بنا پر نہیں آ سکا۔ لیکن آج جبکہ ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ و سیرت کو بگاڑنے کی منظم کوشش ہو رہی ہے اور بھی ضروری ہے کہ یہ کام جلد پایۂ تکمیل کو پہنچایا جائے۔

۴۔ آخری اوقات کے احوال سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے مختلف اوقات میں جو ملک و بیرون ملک اکابرین اور علماء سے مختلف مسائل پر مراسلت کی تھی اسے ترتیب دے کر شائع کرانا چاہتے تھے چنانچہ ایک کتاب تو زیر ترتیب تھی باقی کچھ کا خاکہ مولانا نے بنا رکھا تھا جن میں سے بعض کا تذکرہ انھوں نے مولانا نظام الدین صاحب اصلاحی سے کیا تھا تو جس طرح زیر ترتیب کتاب کی تکمیل ایک کام ہے اسی طرح بقیہ مراسلات کی فراہمی اور ان کی اشاعت وغیرہ بھی ایک اہم اور ضروری کام ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمد شعیب ندوی
استاد جامعۃ الفلاح

مولانا ابواللیث ندوی داماد کی نظر میں

ہر مسلمان جب قرآن کریم اور حدیث شریف کا مطالعہ کرتا ہے اور خلفائے راشدین کی زندگیوں کو پڑھتا ہے اسی طرح جب امت مسلمہ کی تاریخ میں انقلاب برپا کرنے والی شخصیات پر نظر ڈالتا ہے تو فطرۃً اس کے دل و دماغ میں ایک خاکہ اور نمونہ بنتا ہے اور جب اس معیار کو لیکر اپنے ارد گرد کی نمایاں شخصیات کو تولتا ہے تو اسے سخت مایوسی ہوتی ہے۔ کسی رہنما میں دینی علم کی کمی ہے کسی میں سیاسی بصیرت نہیں ہے یا کسی میں اسلامی قوانین اور عبادات کا اپنی زندگی میں نفاذ نہیں ہے اور میں ہندوستان کے اس افراتفری ماحول میں اسلام کی جملہ صفات مطلوبہ سے متصف شخص سے ملاقات کو ناممکن سمجھتا تھا مگر جب میرا نکاح ۱۹۸۳ء میں مولانا کی بچی ساجدہ سلمہا سے ہوا اور مولانا کے شب و روز قریب سے دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی تو جس امر کو ناممکن تصور کرتا تھا وہ تصور باطل ہوگیا اور میں نے اس رشتہ کو اپنی خوش نصیبی سمجھا اور مولانا کی گھریلو زندگی سے بہت کچھ فائدہ حاصل ہوا جو دوسری جگہ نہ حاصل ہو سکتا تھا اور مولانا بھی میرے اس رشتہ کو بہت پسند کرتے تھے انتہائی مطمئن اور خوش تھے بار بار اس رشتہ کو سراہتے تھے۔

اس امر میں کوئی شک نہیں کہ مولانا قرن اول کے سچے نمونہ تھے اور میرا یہ تاثر انفرادی نہیں ہے بلکہ تقریباً ان تمام ہی لوگوں کا ہے جن لوگوں نے مولانا کو قریب سے دیکھا یا جن کے معاملات مولانا سے متعلق رہے ہیں، مولانا کا وجود امت کے لئے عظیم نعمت تھا اور اس انتشار کے زمانہ میں ایسے مرد مومن کی شدید ضرورت تھی اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس امت کو نعم البدل عطا فرمائے۔

مولانا کی نمایاں صفات میں تقویٰ، خشیت، خوف خدا، خدا ترسی قرآن اور حدیث کے احکام کو مضبوطی سے پکڑنا بے لچک رویہ اپنانا، البتہ دنیوی امور میں جس میں شریعت نے گنجائش دی ہو اس میں نرم رویہ اختیار کرتے، زندگی میں سادگی اور انکساری کو پسند کرتے کتابوں کے شوقین تھے خوب

مطالعہ کرتے اور اسی کی گھر میں بھی تعلیم دیتے، انتہائی خلیق اور شفیق ملنسار و غمگسار تھے جسکی وجہ سے سب کے نزدیک محبوب تھے جو شخص بھی ملنے آتا خوش ہوتا، آپ کی زندگی سے متاثر ہوتا اور آپ کے علم سے استفادہ کرتا، بڑا ہو کہ چھوٹا ہو امیر ہو کہ غریب ہو تعلیم یافتہ ہو کہ غیر تعلیم یافتہ ہو سب سے بخوشی ملتے جس کی وجہ سے کسی کو آپ سے ملنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہوتی تھی اور جو کچھ زندگی میں میسر تھا اس کو تواضع کے لئے پیش کرتے اور مہمان کو کھلانے میں خوشی محسوس کرتے۔

مولانا کی ممتاز صفت نماز باجماعت سنن و نوافل تہجد قیام اللیل ہے اور میں اسی اہتمام کا نتیجہ سمجھتا ہوں کہ مرض الموت کے ایام میں بھی کوئی نماز قضا نہیں ہوئی۔ ۵ ردسمبر ۱۹۹۰ء دس بجے دن میں مولانا اس دار فانی سے کوچ کر کے اپنے رب سے جا ملے اور اس روز بھی فجر کی نماز ادا کی تھی بار بار توبہ اور استغفار کرتے۔ "الا بذکر اللہ تطمئن القلوب" آیۃ... دواؤں کے اثر سے زیادہ نیند آتی تھی جب بھی ہوش میں آتے نماز کے متعلق دریافت کرتے، جو سامنے بیٹھے ان کو پہچانتے تھے باتیں کرتے تھے اگر چشمہ نہ لگائے ہوتے تو آواز سے ہی لوگوں کو پہچان جاتے کہ کون کون میرے پاس ہے۔ مولانا نے انتقال کے نصف گھنٹہ قبل بھی دو رکعت نماز ادا کی تھی مولانا کے آخری کلمات یہ ہیں "نماز پڑھلوں" میں نے جواب دیا کہ پڑھ لیجئے چنانچہ لیٹے لیٹے نماز ادا کی۔ کتنی قابل رشک موت تھی اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کو قبول کرے اور جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین

مولانا کو زندگی کے آخری مراحل میں بھی زیادہ تکلیف نہیں ہوئی، ہم لوگوں کی پریشانی دیکھ کر مولانا ہم لوگوں کو خود تسلی دیتے کہ میں بالکل ٹھیک ہوں تم لوگ پریشان کیوں ہو رہے ہو انتقال کے بعد چہرہ بالکل کھلا ہوا، مسکراتا ہوا تھا جن لوگوں نے دیکھا تھا سبھی کہہ رہے تھے کہ چہرہ کتنا اچھا نظر آرہا ہے معلوم ہوتا تھا کہ فرشتے جیسے جنت کی بشارت دے رہے ہوں۔

مولانا نے اپنی زندگی میں دنیا، مال، شہرت سے اپنے آپ کو دور رکھا ملت کے لئے جو کچھ کر سکتے تھے قربانیاں دیکر کرتے مگر نام و نمود سے بچتے اور فرماتے تھے کہ اس سے اجر میں کمی واقع ہو جائے گی ہمیشہ آخرت کو مد نظر رکھتے کچھ مخلص لوگوں نے مولانا سے فیصل ایوارڈ کے بارے میں ذکر کیا تو انتہائی بے لوثی سے جواب دیا کہ کیا یہ سب میں نے اسی دنیا کے لئے کیا ہے، صحیح معنوں میں دنیا کو آخرت کے لئے زاد راہ سمجھتے تھے۔

آپ کی عادت حسنہ تھی کہ رات کی آخری پہر بیدار ہوتے تہجد ادا کرتے دعائیں کرتے توبہ واستغفار کرتے۔ یہی پرسکون ماحول اپنے رب سے مناجات کا خاص وقت تھا اس کے بعد فجر کی اذان ہوتی گھر والوں کو بیدار کرکے نماز کے لئے چلے جاتے، صبح میں چہل قدمی کا پابندی کرتے بقیہ دن میں اپنے جماعتی امور میں پورے طور سے مشغول رہتے اور جب کھانا کھانے کے لئے گھر آتے اسی دوران گھر کے امور کو بھی پورا کرتے، اللہ تعالیٰ نے ذہانت خوب خوب عطا فرمائی تھی طویل کاموں کو مختصر وقت میں پورا کرتے۔ مختصر جامع ومانع گفتگو کرتے، بچوں سے بھی خوب پیار کرتے اور بچے بھی مولانا کو بہت چاہتے تھے۔ گھر جب داخل ہوتے سلام کرتے، بچے جب بیدار ہوتے ان سے سلام ومصافحہ کرتے۔

مولانا کی قابل ذکر صفت یہ بھی ہے کہ معاملات ہمیشہ صاف رکھتے گھر کی جائداد میں کا جو شرعی حق بنا اسکو دیدیا اس میں کبھی تردد نہیں ہوا۔ جن چیزوں کو دوسروں کے ذریعہ خریدا اسکو روپیہ دیکر حساب صاف کرلیتے تاخیر نہیں کرتے تھے، تحفہ قبول کرنے سے گریز کرتے اس خوف سے کہ اس کے پس پشت کوئی مقصد نہ ہو الا یہ کہ جس پر پورا اعتماد ہو۔

مجھے اس بات کا قلق ہے کہ مولانا میرے گھر رہنے کا ارادہ رکھتے تھے اور کہا بھی تھا مگر زندگی نے اور گھر کے امور نے مولانا کو موقع نہیں دیا جب بھی چاندپٹی آتے میرے گھر ضرور آتے اور رہتے اور خوشی محسوس کرتے۔ میرے دونوں بچے محمد عامر اور محمد اسامہ دونوں سے بہت محبت کرتے تھے جس کو یہ سب کبھی فراموش نہیں کرسکتے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم لوگوں کو ابا مرحوم کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے — آمین

(بقیہ: سارا چمن اداس ہے)

سے چھین گئی۔ اور یہ کیسی زبردست بجلی تھی جو پورے نشیمن کو تاراج کرگئی۔

اے ہمارے مہربان رب! تو ہمارے جانے والے اس محبوب دوست کی تربت کو نور سے بھردے۔ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔ انہیں ابرار وشہداء کی رفاقت نصیب فرما۔ اور ان کی شہادت سے ہمارے درمیان جو زبردست خلا پیدا ہوگیا ہے، اس کو اپنی رحمت خاص سے پُر فرما۔ بلاشبہ تیرے لئے یہ کچھ بھی مشکل نہیں۔ تو ہر چیز پر قادر ہے۔ ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

۲۵ رمئی سنہ ۹۱ء

مولانا عبدالعلیم اصلاحی

حضرت مولانا ابواللیث صاحب رحمۃ اللہ علیہ

چند یادیں

ملک کی تقسیم سنہ ۱۹۴۷ء میں ہوئی۔ اس وقت میں مدرستہ الاصلاح میں عربی کی ابتدائی جماعت میں تھا مولانا ابواللیث صاحب مولانا صدرالدین صاحب اور مولانا ابوبکر صاحب ایک ہی ساتھ استاذ کی حیثیت سے آئے تھے اس موقع پر مشہور یہ ہوا کہ مولانا مودودی نے ان حضرات کو بھیجا ہے اس لئے کچھ بزرگ اور اہم اساتذہ نے اجتماعی طور سے استعفا دے دیا تھا مدرسہ کے ذمہ داروں نے مولانا مودودی سے آدمی مانگے تھے حقیقت کیا تھی نہیں معلوم ابواللیث صاحب اعلیٰ جماعتوں میں درس دیتے تھے اس لئے مجھ کو ان سے بہت زیادہ استفادہ کا موقع نہیں ملا پھر بھی وقتاً فوقتاً ہماری جماعت نے بھی ان سے درس لیا ہے مولانا ہماری بورڈنگ کی نگرانی بھی کرتے تھے نماز فجر کے بعد جس انداز سے بورڈنگ کا ایک راؤنڈ لیا کرتے تھے اس کا منظر آج تک نظروں میں ہے اس موقع پر تجاہل کرتے ہوئے اور کبھی سخت انداز میں تنبیہ کرتے ہوئے انکی شان بزرگانہ لائق دید ہوتی۔

مولانا مدرستہ الاصلاح سے وابستہ تھے اور انھیں جماعت اسلامی ہند کا کل ہند امیر منتخب کیا گیا اس طرح مدرستہ الاصلاح کو تحریک اسلامی کا عارضی سہی لیکن پہلا مرکز بننے کا شرف حاصل ہو گیا۔ اور اگر کوئی یہ کہے تو بے جا نہ ہوگا کہ تحریک اسلامی وہ خوش نصیب تحریک ہے جس کو مدرستہ الاصلاح جیسا قرآنی گہوارہ نصیب ہوا غالباً یہی وجہ ہے کہ مدرسہ اور تحریک دونوں ایک دوسرے سے قریب اور متاثر نظر آتے ہیں۔ اور یہ قربت اور تاثر دونوں جگہ باقی رہے گا خواہ دونوں میں کتنے ہی انقلابات آجائیں۔ پچھلے پچاس سال اس پر گواہ ہیں۔

انگریزی حکومت کے ختم ہونے کے تھوڑے دنوں بعد مولانا محفوظ الرحمٰن صاحب "مفتاح القرآن" والے مدرسہ پر آئے جو اس وقت کسی کونسل کے ممبر تھے اور انھوں نے طلبہ اور اساتذہ

کی ایک نشست سے خطاب کیا اور کہا کہ اب حکومت اپنی ہے اور ہم کو اب ایسے ایسے رہنا چاہیے ان کی تقریر کے بعد مولانا ابو اللیث صاحب اٹھے اور کہا کہ آپ کو معلوم ہے کہ ہم کس نظریہ کے ہیں پھر کانگریسی نظریہ کے بالمقابل اپنا نقطہ نظر پیش کیا۔ اس وقت ہم تو کچھ زیادہ نہیں سمجھ سکے تھے لیکن مولانا اختر احسن صاحب اصلاحی نے بعد کی مجلسوں میں مولانا ابو اللیث صاحب کی جرأت اور بروقت اور صحیح طور سے اپنے خیالات کو پیش کرنے کو بہت سراہا اور اپنی خوشی کا اظہار کرتے رہے یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ہر روز سی آئی ڈی والے مدرسہ پر آتے تھے اور مختلف قسم کے سوالات کرتے تھے اور ہر آنے جانے والے پر سی آئی ڈی ہونے کا شبہ ہوتا اور کسی آن بھی مدرسہ بند کرا دینے کا خدشہ لگا رہتا تھا مولانا محفوظ الرحمٰن صاحب اپنی آخری عمر میں مفلوج ہو گئے اور عرصہ تک صاحب فراش رہے مولانا ابو اللیث صاحب برابر ان کی خبر گیری کرتے رہے اور مہراج گنج کے علاقہ میں جب کبھی جاتے تو بطور خاص ان کو دیکھنے جاتے۔

قاضی عدیل عباسی صاحب نے پہلی دینی تعلیمی کانفرنس بستی میں بلائی جس میں دینی تعلیمی کونسل کی بنیاد پڑی اس کانفرنس میں جامعہ مظہر العلوم بنارس کا ایک وفد مولانا اسحاق بنارسی کی سرکردگی میں گیا اس میں میں بھی شامل تھا۔ مولانا اسحاق صاحب مفتی بنارس اور جامع مسجد گیان باپی کے امام مولانا ابراہیم صاحب کے بڑے صاحبزادے تھے اور دوسری کئی حیثیتوں سے بارسوخ شخصیت کے حامل تھے ندوہ اور دیوبند کے سبھی اکابر ان کے یہاں مہمان ہوا کرتے تھے اور سیاسی لحاظ سے جمعیۃ العلماء اور کانگریس سے وابستہ تھے۔

ان کے ساتھ ہونے کی وجہ سے کانفرنس کے دوران ہمارا قیام اس ہال میں تھا جس میں مولانا سعید احمد اکبرآبادی حیات اللہ انصاری وغیرہم قیام پذیر تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک موقع پر حیات اللہ انصاری نے کہا کہ ہم کو جس سے زیادہ اندیشہ تھا وہی سب سے زیادہ سلجھا ہوا ثابت ہوا۔ ان کا اشارہ مولانا ابو اللیث صاحب کی طرف تھا۔ کئی بھی مجلسوں میں ان لوگوں نے کہا کہ ہمارے لوگ اسٹیج پر آتے ہیں تو زیر بحث مسئلہ پر نہ بول کر اپنی اور جماعتی تعریف اور تاریخ بیان کرتے ہیں اور وہ آدمی ہے کہ نہ اپنی تعریف کرتا ہے اور نہ اپنی جماعت کا ذکر کرتا ہے اور کہنے کی بات کہہ جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہوا تھا کہ کانفرنس کی فضا میں تھوڑی تکدر بھی اس طرح پیدا ہو گئی تھی کہ پہلی نشست میں مولانا نعمانی نے ایک قرارداد پڑھنی شروع کی جو پہلے سے تیار کردہ تھی۔ مولانا نعمانی کچھ ہی آگے بڑھے تھے کہ مولانا ابو اللیث صاحب

جو ڈائس کے نیچے بیٹھے تھے کھڑے ہو گئے اور تھوڑی تمہید کے بعد فرمایا کہ اس قرارداد میں یہاں آئے ہوئے نمائندوں کی رائیں بھی شامل کرنی چاہئیں۔ اس کی تائید میں بعض دوسرے لوگوں نے بھی اظہار خیال کیا۔ اور نتیجے کے طور پر دوسری قرارداد مرتب کرنے کے لئے ایک کمیٹی بنائی گئی اور وہ نشست ختم ہو گئی یہ ایک ایسی بات تھی کہ جس کی وجہ سے اسٹیج سے نیچے بیٹھا ہوا ایک آدمی جیسے سب سے اوپر ہو گیا۔ یہ صورت حال ایک طبقہ پر بڑی گراں گزری کئی لوگوں کو مولانا ابو اللیث صاحب کی شان میں نازیبا الفاظ کہتے ہوئے سنا گیا۔ مگر اس طرح ہوا یہ کہ بھی گفتگوؤں کا موضوع مولانا کی ذات اور جماعت اسلامی ہو گئی۔

چار سال پہلے کی بات ہے مولانا مرکز میں اپنا قائم مقام جناب سراج الحسن صاحب کو بنا کر چاند پور چلے گئے تھے پھر بغرض علاج حیدرآباد تشریف لے گئے۔ مولانا عبدالعزیز صاحب نے ان کے قیام کا انتظام ملک پیٹ لانسر میں ایک مکان میں کرایا جس کے مالک اپنی فیملی کے ساتھ ملک سے باہر تھے۔ مولانا کے استقبال کے لئے مولانا عبدالعزیز صاحب اور دوسرے ذمہ دار حضرات اسٹیشن گئے مولانا کے ایک مالک دیرینہ معتقد عبدالحفیظ صاحب بھی اسٹیشن گئے اور ساتھ ہی قیام گاہ پر آئے خاں صاحب نے مولانا کو دعوت دی اس وقت معلوم ہوا کہ مولانا نے آنے سے پہلے شرط لگا دی تھی کہ میں کسی کے یہاں دعوت نہیں کھاؤں گا اور علاج میں جو خرچ ہو گا اس کو خود برداشت کروں گا خوش قسمتی سے ان دنوں میں مولانا کی قیام گاہ سے قریب ہی رہ رہا تھا۔ اس طرح نماز فجر اور نماز عشاء کے بعد بلا ناغہ کچھ وقت ضرور مولانا کی صحبت میں گزارنے اور تھوڑی بہت خدمت کرنے کا موقع ایک ماہ تک ملتا رہا۔ اس دوران بہت سی گھریلو اور نجی باتیں، مدرستہ الاصلاح اور ندوۃ العلماء کے تعلق سے اور اپنے اساتذہ کے بارے میں بہت سے تذکرے وقتاً فوقتاً لطف لیتے ہوئے کرتے مولانا نے بتایا کہ ابھی تم کو معلوم ہے میں مدرستہ الاصلاح کیسے پہنچا۔ بندی گھاٹ میں میرے پھوپھا شیخ محبوب علی صاحب تھے ان کے یہاں میں رہتا تھا میرے پھوپھا محمد آباد گوہنہ شیخ واڑہ میں غالباً حمید صاحب کے کارندے تھے۔ یہ لوگ بڑے جاگیردار تھے اسی خاندان کے قاضی اشفاق ہیں جو اسٹریلیا میں ہیں ایسا اتفاق ہوا کہ قاضی اشفاق صاحب انہیں دنوں حیدرآباد آئے اور مولانا سے ملاقات کی تو مولانا نے بیان کیا کہ میرے پھوپھا نے مجھے مدرستہ الاصلاح بھیجا اس لئے کہ وہاں بندی کے کئی لڑکے پڑھ رہے تھے اور مولانا سعید صاحب وہاں بزرگ اساتذہ میں تھے۔ میرے پھوپھا مجھے بہت چاہتے تھے میرے لئے مدرسہ پر ایک بار پیپ جو تا بھیجا تو مدرسہ کے

بقیہ صفحہ ۷۸ پر

مولانا ابواللیث صاحبؒ بیٹی کی نظر میں

• ساجدہ ہلالی

میرے شفیق ابا جان مرحوم جن کو مرحوم لکھتے ہوئے دل غم واندوہ سے بھر جاتا ہے۔ افسوس کہ آج دنیا میں نہیں رہے لیکن ان کی یادیں ہمارے دلوں کو ہمیشہ جھنجھوڑتی رہیں گی ان کی پدرانہ شفقت اور بے لوث محبت ہمیں بار بار اشکبار کئے دیتی ہیں وہ بہت ہی شفیق مہربان نرم خو اور معتدل مزاج انسان تھے ہم لوگوں سے ابا کی بے پناہ محبت تھی مجھے یاد نہیں کہ ابا نے کبھی ہمیں ڈانٹا ہو یا مارا ہو بلکہ اگر کبھی ہم سے کوئی غلطی سرزد ہو جاتی تو وہ بہت پیار محبت اور شفقت کے انداز میں ہمیں سمجھاتے جس سے ہم لوگ مسرور ہو جایا کرتے تھے اور ان کی بے پایاں محبت والدہ مرحومہ کے انتقال پر ملال کے بعد دوگنی ہو گئی تھی مجھے یاد ہے کہ والدہ کے انتقال کے غالباً دوسرے تیسرے دن ابا جان نے ہم چھوٹی تینوں بہنوں کو بہت ہی پیار سے اپنے پاس بٹھایا اور صبر وضبط اور والدہ سے آخری ملاقات سے متعلق متعدد حدیث سنانے کے بعد فرمایا "بیٹی اب میں ہی تم لوگوں کی ماں بھی ہوں اور باپ بھی جو کہنا ہو اب مجھ سے کہنا میں انشاءاللہ پورا کروں گا کہتے کہتے ابا جان کی آنکھیں بھر آئی تھیں یقیناً ابا جان نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا اور ہمیں کسی قسم کی کبھی کوئی تکلیف نہیں ہونے دی بلکہ پہلے کی نسبت ہماری ضروریات کا اور زیادہ خیال کرنے لگے اور ہماری ادنیٰ ادنیٰ خواہش کو بھی حتی الامکان پورا کرنے کی کوشش کرنے لگے مثلاً چند سال قبل انھیں میری چھوٹی بہن سے پتہ چل گیا کہ مجھے دلی کی گزک بہت پسند ہے جو صرف سردیوں میں ملتی ہے اس وقت سے ابا جان موسم میں ایک دو بار میرے لئے گزک ضرور بھیج دیا کرتے تھے والدہ کے انتقال کے بعد سے وہ ہم لوگوں کی طرف سے بہت زیادہ فکرمند ہونے لگے تھے اور ان کی گھریلو ذمہ داریاں بھی بہت بڑھ گئی تھیں چونکہ ہماری بڑی بہنیں اپنے گھر رہتی تھیں اور بھائی جان دلی میں مقیم تھے جس کی وجہ سے ابا جان کیلئے ہم لوگوں کو تنہا چھوڑ کر قرب وجوار کے اجلاس واجتماعات

• مولانا ابواللیث اصلاحی مرحوم کی پانچویں بیٹی اور مولانا شعیب ندوی استاذ جامعہ کی اہلیہ محترمہ

میں شرکت کرنا بھی ایک مسئلہ بن گیا تھا لہٰذا وہ بہت ہی دکھ بھرے انداز میں معذرت کرتے کہ "بھائی میں رات میں بچیوں کو تنہا نہیں چھوڑ سکتا" اس موقع پر مجھے ابا جان کی بے بسی پر بے حد تکلیف ہوتی لیکن ابا جان کبھی دل برداشتہ نہیں ہوئے اور کبھی ماں کی کمی کا احساس تک نہ ہونے دیا امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو انکے دیگر نیک اعمال کے ساتھ اس کا بھی اجر عظیم عطا فرمائے گا۔

ابا جان مرحوم ہمارے لئے صرف ایک مہربان مربی و شفیق باپ ہی نہیں بلکہ اسوۂ رسولؐ کے عملی نمونہ اور مشعل ہدایت بھی تھے وہ ایک عالم باعمل تھے ابا کی عملی زندگی سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ وہ اگرچہ بہت واعظانہ گفتگو کے تو عادی نہ تھے اور نہ ہی جماعت کی گوناگوں مصروفیات نے ان کو اس کی اجازت دی کہ وہ گھر پر باقاعدہ درس وتدریس کا کام مسلسل انجام دیتے تاہم وہ گھر والوں خصوصاً بچوں کی تربیت کی طرف سے غافل نہ تھے وہ ہماری گفتگو بات چیت افکار وخیالات پر پوری توجہ رکھتے تھے اور چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے ہمیں دین کی باتیں سکھاتے رہتے تھے اور موقع ومحل کے اعتبار سے آیات قرآنی اور احادیث مسنونہ کے ذریعہ ہماری تربیت فرماتے۔

اسی طرح کھیتی کے سلسلہ میں چونکہ ہماری زمین لپے کے عوض دوسرے مختلف لوگوں کے پاس رہی ہیں اگر ہم نے کبھی کسی پر شبہ ظاہر کیا کہ پیداوار میں سے پورا حصہ نہیں دیا گیا تو فوراً بدگمانی میں نہ پڑنے کی ترغیب دی اور فرمایا۔

"یاایھا الذین آمنوا اجتنبوا کثیرا من الظن ان بعض الظن اثم"

اسی طرح ہر ایک موقع پر دوسروں کے لئے بھلائی کی ترغیب دینے کی تلقین فرماتے ہوئے اس حدیث کو یاد دلایا۔

من رأی منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ وان لم یستطع فبلسانہ وان لم یستطع فبقلبہ وذلک اضعف الایمان۔

یہ اور اسی طرح کے دیگر مواقع ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ابا جان مرحوم ایک عام باپ کی طرح ہمارے صرف دنیوی راحت وآرام کے خواہاں نہ تھے بلکہ اس کے ساتھ ابا کو ہماری اخروی فلاح وکامرانی کی فکر بھی پورے طور پر دامن گیر تھی جس کے لئے وہ اپنی عدیم الفرصتی کے باوجود سعی کرتے رہتے اور بوقت ضرورت بہت ہی مشفقانہ انداز میں ہماری سرزنش اور اصلاح فرماتے وقتاً فوقتاً

ہمیں دعا مسنونہ پڑھ کر سناتے اور انھیں یاد کر لینے کی تلقین فرماتے ہم لوگ ابا جان مرحوم سے ان کی بے پناہ الفت ومحبت کی وجہ سے بلا جھجک بات کرنے کے عادی تھے اور ابا جان بھی گھر کے تقریباً تمام ہی امور میں ہم لوگوں سے گفتگو اور رائے مشورہ لینا ضروری خیال کرتے تھے۔

ابا بہت ہی زاہد و متقی پرہیزگار، عبادت گزار اور خوف خدا سے لرزاں و ترساں رہنے والے انسان تھے ہمیشہ تہائی شب میں بیدار ہو جاتے اور انتہائی خشوع وخضوع کے ساتھ نماز، دعا اور توبہ واستغفار میں معروف رہتے حتی کہ فجر کی اذان ہو جاتی اذان کے بعد ابا ہم لوگوں کی طرف متوجہ ہوتے اور ہمارا جواب پالینے کے بعد مسجد کا رخ کرتے مسجد سے واپسی پر ایکبار پھر گھر والوں پر طائرانہ نگاہ ڈالتے کہ آیا ابھی کوئی بستر پر تو نہیں ہے اگر کوئی نظر آیا تو اسے نام لے کر آواز دیتے اور پھر چہل قدمی کے لئے چل کر ابا کا ہمیشہ کا معمول رہا ہے نکل جاتے واپس آتے تو سورج طلوع ہو چکا ہوتا یہ وقت بچوں سے ملاقات کا وقت ہوتا ابھی بچوں کو نام بنام پکارتے اور ان سے سلام ومصافحہ کرتے اور اس کے بعد اشراق کی نماز ادا کرتے اور ناشتہ کے لئے بیٹھ جاتے ناشتہ کے دوران اخبار دیکھنے میں معروف رہتے اور ناشتہ کے بعد دفتر میں یا مطالعہ کی میز پر لکھنے میں معروف ہو جاتے چنانچہ صبح اور بعد مغرب سے عشاء تک کا وقت ایسا ہوتا جبکہ ابا جان ہمارے درمیان ہوتے اور ضروری معاملات میں بات چیت اور استفادہ ہوتا یوں تو ابا ہر وقت ہی اپنے احباب ومتعلقین سے ملنے میں مسرت محسوس کرتے لیکن عصر بعد کا وقت ہمیشہ ملاقاتیوں کے لئے خاص رہا ہے اور اس طرح ابا کی بے شمار ذمہ داریوں اور مصروفیتوں کی بنا پر ہمیں ان سے فیض یاب ہونے کا بہت کم موقع مل پاتا تاہم ابا کے عمل وکردار، سادہ زندگی، قناعت پسندی اور گھر کے دیندارانہ ماحول نے بڑی حد تک ہماری رہنمائی فرمائی یہی وجہ ہے کہ ہم نے ابا جان مرحوم سے دنیا کو دیکھ کر کسی بڑی چیز کی مانگ یا اونچی سطح کی کسی چیز کی خواہش ظاہر نہیں کی جس کو وہ پورا نہ کر سکے ہوں۔

ابا کے تقویٰ کا حال یہ تھا کہ جماعت کی ادنیٰ درجہ کی چیز بھی اپنی ذات پر خرچ کرنے سے پورا اجتناب کرتے جامعۃ الفلاح کے دور نظامت میں میں نے ابا سے ایک سادہ لفافہ مانگا تو فرمایا میرے پاس نہیں ہے میں نے برجستہ کہا ابا میں نے آپ کی میز پر ایک لفافہ دیکھا ہے تو عرض کیا "ہاں لیکن وہ جامعہ کا ہے اسے میں ذاتی ضرورت میں نہیں استعمال کر سکتا تمہارے لئے منگوا دونگا"

(بقیہ: صـ۱۳ پر)

ابوسفیان اصلاحی
(علی گڑھ)

آہ! مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی

پانچ دسمبر ۱۹۹۰ء نے عالم اسلام کی ایک اہم شخصیت کو ہم لوگوں سے چھین لیا (انا للہ وانا الیہ راجعون)، دنیائے اسلام اسے مولانا ابواللیث اصلاحی اور ندوی کے نام سے جانتی ہے۔ مولانا تقسیم ہند کے بعد سے مسلسل جماعت اسلامی ہند کے امیر چلے آرہے تھے۔ چند سالوں کے علاوہ جماعت اسلامی انھیں کی قیادت وسیادت میں پروان چڑھتی رہی۔ چند مہینوں پیشتر اپنی نقاہت کے سبب امارت کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو کر مسلسل آرام کی غرض سے اپنے وطن چلے گئے تھے مولانا کا تعلق اعظم گڑھ کے ایک چھوٹے سے گاؤں چاند پٹی سے تھا۔ اس چھوٹی سی بستی سے اٹھ کر انھوں نے ملت اسلامیہ بالخصوص مسلمانان ہند کی ناقابل فراموش خدمات انجام دیں۔

مولانا ابواللیث اصلاحی وندوی نے مدرسۃ الاصلاح اور ندوۃ العلماء لکھنؤ میں تعلیم حاصل کی۔ مدرسۃ الاصلاح کے فکری بانی مولانا حمید الدین فراہیؒ سے بہت قریب تھے۔ مولانا فراہیؒ کی طرح وہ بھی غیر معمولی متقی، عابد اور خدا ترس تھے۔ مولانا کی مولانا فراہیؒ سے بہت مماثلت تھی۔ اگر جماعت اسلامی کے انتظامی امور کے بار گراں سے انھیں فرصت ملی ہوتی تو وہ قرآنیات پر بڑا کام انجام دیتے۔ جماعت اسلامی کی ذمہ داریوں کو سنبھالنے سے قبل اور بعد میں بھی مولانا نے مدرسۃ الاصلاح کے ترجمان رسالہ "الاصلاح" اور "ترجمان القرآن" میں قرآنیات پر کئی مؤقر و تحقیقی مضامین لکھے مولانا فراہیؒ اور ان کے شاگردوں مولانا اختر احسن اصلاحیؒ اور مولانا امین احسن اصلاحی سے فکری قربت ہونے کی وجہ سے قرآنیات کے مختلف پہلوؤں پر غور وخوض کرتے تھے۔ ابھی حال ہی میں مولانا امین احسن اصلاحی سے میری ایک ملاقات ہوئی تو انھوں نے ان کی انتظامی صلاحیتوں سے کہیں زیادہ ان کی علمی صلاحیتوں کا نہ صرف ذکر کیا بلکہ سراہا۔ مولانا نے اردو کے ساتھ عربی میں بھی لکھا۔ ندوہ کے "الضیاء" میں ان کے کئی مقالات شائع ہوئے۔ الاصلاح اور ترجمان القرآن میں شائع شدہ

ان کے کچھ مقالات کے عناوین حوالوں کے ساتھ نقل کر رہا ہوں۔ (۱) قرآن اور ترتیب اسماء انبیاء کرام (الاصلاح۔ فروری ۱۹۳۶ء ۲/۱) (۲) سورہ ہود کے متعلق ایک اہم سوال کا جواب (الاصلاح مارچ ۱۹۳۶ء ۲/۲) (۳) قرآن مجید اور نسخ (الاصلاح۔ جون ۱۹۳۶ء ۱/۶) (۴) قرآن میں تکرار کی نوعیت اور قصہ آدم و شیطان کی نوعیت (الاصلاح۔ اپریل ۱۹۳۶ء ۱/۳) (۵) ایک آیت کے مفہوم کی تحقیق (ترجمان القرآن رجب ۱۳۵۳ھ ۱/۷) (۶) تفسیر سورہ فیل (ترجمان القرآن۔ جمادی الاخری ۱۳۵۳ھ ۶/۴) (۷) قصہ یوسفؑ (ترجمان القرآن۔ ربیع الثانی ۱۳۵۳ھ ۶/۵)۔

مذکورہ بالا قرآنیات سے متعلق مولانا کے ان چند مضامین سے بخوبی انداز لگایا جا سکتا ہے کہ قرآنیات سے ان کا کتنا گہرا ربط تھا۔ اگر وہ مستقل قرآنیات پر لکھتے رہتے تو اس میدان میں عظیم کارنامے انجام دیتے۔ جب کہ یہ بھی قرآنیات کے سلسلے میں انکی عظیم خدمات ہیں۔ ان دونوں رسالوں کے علاوہ بھی انھوں نے ہند و بیرون ہند کے مختلف مجلات میں مختلف موضوعات پر مضامین لکھے مدینہ بجنور اور "فاران" کے مدیر بھی رہے۔ ان میں بھی انھوں نے کثرت سے لکھا ہوگا۔ کاش کہ جماعت اسلامی ہند ان کے بکھرے ہوئے کاموں کو کتابی صورت میں علمی دنیا کے سامنے پیش کر دیتی۔ چلتے چلتے انھوں نے نہایت دلنشیں انداز میں ایک کتابچہ "جماعت اسلامی کی تشکیل، کیوں اور کیسے؟" کے عنوان سے تحریر کیا۔ مولانا کے کچھ اور بھی چھوٹے چھوٹے رسالے ہیں۔ جماعت اسلامی کے سلسلے میں مولانا حسین احمد مدنیؒ سے جو خط و کتابت ہوئی وہ بھی گراں قدر کام ہے۔ یہ خط و کتابت مولانا کی ذہانت و فطانت اور علمی پختگی کی طرف بڑے واضح انداز میں اشارہ کرتی ہے۔ مولانا کے قلم میں ایک وقار اور متانت تھی۔ وہ ہر بات کو مدلل انداز میں کہنے کے عادی تھے۔

مولانا کی علمی زندگی پر قدرے روشنی ڈالنے کے بعد اب ہم کچھ اپنے ذاتی اور کچھ دوسروں کے بتائے ہوئے مولانا سے متعلق واقعات کو نقل کریں گے۔ مولانا سے خود میرے اچھے مراسم تھے میں دلی میں اکثر جماعت اسلامی ہند ہی میں قیام کرتا ہوں جس کی وجہ سے مولانا سے بہت سی ملاقاتیں بھی ہیں۔ دلی پہنچنے پر میری سب سے بڑی خواہش یہی ہوتی کہ مولانا سے ملوں۔ ملنے پر وہ سب سے پہلے ڈاکٹر اشتیاق احمد صاحب اور جناب اختر علی خاں صاحب (مولانا کے سگے بھانجے جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ تعلیم میں ریڈر ہیں) کی خیریت دریافت کرتے جب تک مولانا کی صحبت میں بیٹھتا وہ کچھ نہ کچھ

پوچھتے رہتے۔ میں نے ایک بات مولانا کی مجلس میں محسوس کی کہ وہ کسی کو بور نہیں ہونے دیتے۔ وہ اپنی گفتگو میں لوگوں کے مزاج کا ضرور خیال رکھتے۔ مولانا غضب کے مہمان نواز تھے۔ جب کوئی ان سے ملتا خیریت دریافت کرنے کے بعد اس کے لئے چائے اور پانی کا انتظام کرتے۔

مہمان نوازی ہی سے متعلق ان کا ایک واقعہ ان کے بھانجے جناب اختر علی خاں صاحب کے حوالہ سے نقل کرتا ہوں۔ مولانا جس وقت اپنے گھر پر ہوتے تو ان کی عادت تھی کہ باہر کھانا منگا کر کھاتے اور جو بھی کوئی گاؤں کا فرد گزرتا اسے بلاتے رہتے اور اس طرح مختلف لوگوں کا ان کے دسترخوان پر اجتماع ہو جاتا۔ لوگوں کی اتنی کثرت ہو جاتی کہ مولانا کے گھر کے برتن کم پڑ جاتے۔ برتن کم پڑنے پر خاں صاحب نے بتایا کہ ناشتہ دان کے ڈبے اور ڈھکن تک استعمال ہو جاتے، اس پر مولانا کی بیگم خفا ہو کر مولانا سے فرماتیں کہ اگر آپ کو کھلانے کا اتنا ہی شوق ہے تو برتن اور طشتریوں کا انتظام کر لیں۔ اس بری کا جواب یوں دیتے کہ اچھے ابو سعید کی اماں بس بس اب ایسا نہیں ہوگا۔ لیکن دسترخوان بچھا اور مولانا کے مہمانوں کی آمد شروع۔

مولانا کا ایک واقعہ جناب ڈاکٹر اشتیاق احمد ظلی صاحب نے سنایا کہ گزشتہ سال ظلی صاحب ڈاکٹر عبید اللہ فراہی صاحب اور مولانا اشفاق احمد اصلاحی کسی کام سے علی گڑھ سے بذریعہ گنگا جمنا دہلی مولانا سے ملنے گئے۔ فجر بعد یہ قافلہ مولانا کے یہاں آن پہنچا۔ اشفاق صاحب نے دستک دی اور بغیر اجازت کے اندر دھڑ سے داخل ہو گئے۔ اس وقت مولانا ناشتہ کر رہے تھے۔ اس آفت ناگہانی کو دیکھتے ہی مولانا نے اپنا ناشتہ پیچھے چھپا دیا۔ اس پر جناب مرزا اشفاق صاحب مصر ہوئے کہ مولانا آپ جو تناول فرما رہے تھے اسے ہم بھی کھائیں گے۔ مولانا نے کہا کہ میں تم لوگوں کے لئے ابھی ناشتہ منگاتا ہوں لیکن یہ جب نہ مانے تو انھوں نے دکھایا۔ یہ حضرات کیا دیکھتے ہیں کہ عالم اسلام کی یہ عظیم شخصیت اور امیر جماعت اسلامی ہند باسی روٹی اور شکر کا ناشتہ کر رہی ہے۔ مولانا کو ہمیشہ اپنے فقر پر فخر رہا۔ اگر چاہتے تو اپنے بیٹے کو باہر ایک سے ایک اہم عہدے پر فائز کرا دیتے لیکن مولانا نے ہمیشہ اپنے کو مادیت سے دور رکھا۔ مولانا کے بیٹے دلی کے ایک اسکول میں ملازم رہے لیکن اب اسے بھی چھوڑ کر گھر چلے گئے ہیں۔

تقسیم ہند کے بعد ایسا محسوس ہوا کہ جماعت اسلامی ہند دم توڑ دے گی۔ مولانا مودودی کی

پوری توجہ کا مرکز جماعت اسلامی پاکستان تھی خود مولانا مودودیؒ بھی یہاں سے مایوس ہو چکے تھے لیکن جماعت اسلامی ہند کو مولانا ابواللیث صاحبؒ نے ایسا منظم کیا کہ وہ پھر اپنی منزل کی طرف سرگرم سفر ہو گئی اور اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ دعوت دین اور احیائے اسلام کے سلسلے میں جماعت اسلامی ہند جماعت اسلامی پاکستان سے بہت آگے نکل گئی۔ انھیں سرگرمیوں میں مولانا کی صحت گرتی گئی اور لکھنے پڑھنے کا کام بند ہو گیا۔ تحریک اسلامی کی مشغولیات نے مولانا کو بہت بڑا مصنف تو نہ بننے دیا لیکن وہ شخصیت ساز بن گئے۔ شخصیت سازی اور کردار سازی میں مولانا اپنی مثال آپ تھے۔ جماعت اسلامی میں آنے کے بعد انھوں نے صرف شخصیت سازی کا کام انجام دیا۔ وہ حسن البناء شہیدؒ کے اس قول کے مصداق تھے کہ "انا اصنف الرجال"۔

مولانا نے اپنی پوری زندگی تحریک اسلامی میں اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے بسر کر دی۔ اس تحریک سے مولانا کو کس قدر والہانہ اور جذباتی لگاؤ تھا اس کا اندازہ ان کے ایک واقعہ سے کیا جا سکتا ہے۔ جب درس گاہ اسلامی رامپور میں وہ استاذ تھے تو درس و تدریس ہی کے درمیان ایک مرتبہ اتنا شدید بیمار ہو گئے کہ انھیں اپنے وطن آنا پڑا۔ اور تین ماہ گھر ہی پر رہے۔ اس درمیان پابندی سے وہاں تنخواہ آتی رہی اور مولانا اسے واپس کرتے رہے۔ واپس کرتے ہوئے جناب اختر علی خان صاحب مختلف دلائل پیش کرتے ہوئے لینے پر اصرار کرتے لیکن مولانا کا یہی جواب رہتا کہ جب ہم نے کام نہیں کیا ہے تو ہمیں لینے کا کیا حق ہے کیا جماعت اسلامی خیرات خانہ ہے۔ اس میں دو رائے نہیں کہ مولانا مودودیؒ کے انتقال سے جماعت اسلامی پاکستان ۱۹۷۹ء میں یتیم ہو گئی تھی اور اب جماعت اسلامی ہند مولانا کے انتقال سے یتیم ہو گئی ہے خدا نہ کرے کہ یہ خلا پیدا ہو اور تحریک اسلامی کا یہ ادارہ سربلندی اسلام کے لئے پا بہ رکاب رہے۔

(بقیہ مولانا ابواللیث چند یادیں)

سب لوگ میرا جوتا دیکھنے آتے تھے اور ایک چرچا تھا کہ شیر محمد کے پاس پمپ جوتا آیا ہے یہ واقعہ بیان کر کے مولانا بہت محظوظ ہوتے اس وقت پمپ جوتا جتنا عجیب تھا اس سے زیادہ عجیب مولانا کی سادگی اور وضعداری تھی کہ زندگی بھر جوتے کی وضع نہیں بدلی۔ اللہ تعالیٰ مولانا کی نیکیوں کو قبول فرمائے اور خطاؤں سے درگذر کرے اور ملت کو ان کا نعم البدل عطا کرے۔ آمین۔

انٹرویو

• مولاناؒ کی صاحبزادی صالحہ تبسم

ملاقاتی : محمد اسمٰعیل فلاحی

باپ کا پیار بھی دیا، ماں کی ممتا بھی

سوال :- آپ نے اپنے والد کو کیسا پایا؟ ان کا رویہ آپ کے ساتھ کیسا تھا۔

جواب :- میرے والد محترم مرحوم بہت ہی پُر خلوص، ہمدرد اور غمگسار تھے ہماری تھوڑی سی تکلیف پر وہ بے چین و پریشان ہو جاتے تھے۔ اور ہم لوگوں پر بہت شفقت فرماتے تھے۔ ہماری والدہ مرحومہ کا انتقال ۵ اکتوبر ۱۹۸۱ء کو ہوا تھا۔ اور اس طرح تقریباً ۹ سال سے ابو جان نے ہم لوگوں کو صرف باپ کا پیار نہیں دیا بلکہ ان کی ممتا بھی دی تھی۔ ہماری والدہ مرحومہ کے انتقال کے بعد ہمارے ابا جان نے ہم سے یہ کہا تھا "اب میں تمہارا صرف باپ ہی نہیں ہوں بلکہ ماں بھی ہوں۔" اور حقیقتاً ہمارے ابا جان نے اس کو پورا کر دکھایا۔ اور ہم لوگوں کو کسی بھی طور سے ماں کی کمی کا احساس نہیں ہونے دیا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔

سوال :- مولانا آپ پر شفقت فرماتے تھے یا ان کا انداز آپ کے ساتھ سخت تھا؟

جواب :- ابا جان ہم لوگوں کے ساتھ بہت ہی مشفقانہ رویہ اختیار فرماتے تھے اور کبھی کسی کام میں سختی نہیں کرتے تھے۔

سوال :- خود آپ مولانا سے مانوس تھیں اور ان سے قریب رہتی تھیں یا انسیت نہیں تھی

اور دور دور رہنا پسند کرتی تھیں ؟

جواب :- ہم لوگ ابا جان سے بہت مانوس تھے اور بے تکلف بات چیت کرنے کے عادی تھے۔

سوال نمبر :- کیا مولانا نے کبھی آپ کو ڈانٹا ہے ؟

جواب :- مجھ کو یاد نہیں کہ ابا جان نے ہمیں کبھی ڈانٹا ہو وہ ہمیشہ ہم لوگوں کے ساتھ نرمی کا رویہ اختیار فرماتے تھے۔ اور والدہ مرحومہ کے انتقال کے بعد ان کی محبت، ہمدردی، خلوص اور نرمی میں مزید اضافہ ہوتا ہی گیا تھا۔

سوال نمبر :- مولانا آپ کے سلسلے میں کس بات پر زیادہ توجہ دیتے تھے اور کن باتوں کی زیادہ تاکید فرماتے تھے ؟

جواب :- اپنی جماعتی سرگرمیوں کی وجہ ابا جان ہم لوگوں کو وعظ و نصیحت کرنے کا موقع تو بہت کم ہی نکال پاتے تھے، البتہ اپنی عملی زندگی سے انھوں نے ہم لوگوں کو بہت کچھ سکھایا ہے۔

سوال نمبر :- کیا کبھی مولانا نے آپ کو پڑھایا بھی ہے ؟ اگر پڑھایا ہے تو کن کن کتابوں یا مضامین کو ؟

جواب :- ابا جان نے مجھ کو باقاعدہ تو نہیں پڑھایا ہے۔ البتہ تعلیم کے دوران اگر کہیں کہیں دشواری پیش آجاتی تو پوچھ لیا کرتے تھے۔ اور ابا جان سمجھا دیتے تھے۔ البتہ میری بڑی بہن (جن کا نام راشدہ ہے) کو ابا جان نے گھر ہی پڑھا کر جامعۃ الفلاح سے پرائیویٹ امتحان دلوایا تھا۔

سوال نمبر :- کیا اسلامی اخلاق و کردار اپنانے پر بھی کبھی متوجہ فرماتے تھے ؟

جواب :- ابا جان ہم لوگوں سے کبھی حکماً اور زبردستی کام نہیں لیتے تھے۔ بلکہ اپنے عمل و کردار سے ہم لوگوں کو اسلامی اخلاق و کردار کی طرف متوجہ فرماتے تھے۔ لیکن ہم سے اگر کوئی غیر اسلامی اور غیر شرعی کام سرزد ہو جاتا تو متنبہ فرماتے تھے۔

سوال نمبر :- کیا تحریک اسلامی کی کتابوں اور مطالعہ کی طرف بھی کبھی متوجہ فرمایا تھا اور آپ کے اس طرف توجہ کرنے یا نہ کرنے پر مولانا کا تاثر کیا ہوتا تھا ؟

جواب :- تحریک اسلامی کی کتابوں اور مطالعہ کی طرف زیادہ توجہ تو نہیں فرماتے تھے، لیکن جب

ہمارے لائق کوئی کتاب ان کو دستیاب ہو جاتی تھی۔ تو خود مطالعہ کرنے کے بعد وہ کتاب یا رسالہ ہم لوگوں کو دے دیا کرتے تھے۔

سوال نمبر :- مولانا کے تحریکی کثرت مشاغل کی وجہ سے خانگی امور کی انجام دہی میں مولانا سے غفلت تو نہیں ہو جاتی تھی جس کی وجہ سے آپ کو پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا رہا ہو ؟

جواب :- یہ بات غالباً حیران کن ہوگی کہ ابا جان دعوت اسلامی کی سرگرمیوں، تحریکی کثرت کار اور اپنے بے شمار مشاغل و مصروفیات کے باوجود خانگی امور کی انجام دہی میں غفلت نہیں فرماتے تھے۔ اور ہماری چھوٹی چھوٹی چیزوں اور ضرورتوں کا خیال فرماتے تھے۔

سوال :- کیا کبھی مولانا سے آپ کو کوئی شکایت ہوئی ہے۔

جواب :- ہم کو ابا جان سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی۔

سوال :- کیا کبھی مولانا کو آپ سے شکایت ہوئی ہے اور اگر ہوئی ہے تو کس طرح کی بات پر ؟

جواب :- اپنی دانست میں ہم نے ابا جان کو کبھی کسی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ (واللہ اعلم)

سوال :- مولانا سے آپ کی مانگ کس طرح کی ہوتی تھی وہ کہاں تک انھیں پورا کرتے تھے یا رد کرتے تھے ؟

جواب :- یوں تو ہم لوگ ابا جان سے خود ہی اپنی خواہشات کا اظہار بہت کم کرتے تھے۔ لیکن اگر ہم نے کبھی کسی خواہش کا اظہار کیا یا کوئی مانگ کی تو ابا جان حتی المقدور اس کو پورا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

سوال :- آپ بھائی بہنوں میں مولانا کس کو زیادہ چاہتے تھے یا کس سے زیادہ محبت کرتے تھے ؟

جواب :- ہم لوگ چھ بہنیں اور ایک بھائی ہیں۔ میں اپنے والدین کی سب سے چھوٹی اولاد ہوں۔ ان کی غیر معمولی شفقت و محبت اور نرمی کی وجہ سے مجھ کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ابا جان مجھ کو ہی زیادہ چاہتے تھے۔ اور میرے خیال سے ہر ایک اپنے طور سے یہ سمجھتا ہوگا کہ ابا جان مجھے زیادہ چاہتے ہیں۔ کیونکہ ان کا انداز ہی کچھ ایسا تھا۔ وہ اسوۂ رسول کے پوری طرح پابند تھے۔

(بقیہ صفحہ ۱۰۶ پر)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مولانا ابواللیث رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت کے چند پہلو

—— سید یوسف دہلی

ستمبر ۱۹۸۵ء سے دسمبر ۱۹۹۰ء کی سوا پانچ سال کی انتہائی قلیل مدت تحریک اسلامی ہند کے لئے ایک عظیم نقصان در نقصان کا دور ثابت ہوئی جب کہ اس کے صف اول کے قائدین امیر، قیم اور مرکزی مجلس شوریٰ کے ارکان۔ یکے بعد دیگرے اس دار فانی سے کوچ فرما گئے۔ اپنی دینی و ملی خدمات کے اجر و ثواب کی درخواست لئے اپنے رب رحیم سے جا ملے! انا للہ وانا الیہ راجعون۔ جماعت کے لئے اس سانحاتی دور کا آغاز ۲۰ ستمبر ۱۹۸۵ء کو ہوا جب کہ جماعت کے بہترین خطیب جناب سید حامد حسین صاحب فریضۂ حج کی ادائیگی کے بعد جدہ میں ۲۰، ۹، ۱۹۸۵ء کو ایک کار حادثہ کے نتیجہ میں انتقال فرما گئے۔ اسکے بعد پورے آٹھ ماہ بھی نہیں گزرنے پائے تھے کہ جماعت کے ایک عظیم عالم و فقیہ مولانا سید احمد عروج قادری صاحب مدیر زندگی نو کا مختصر سی علالت کے بعد بریلی کے اسپتال میں ۱۷ مئی ۱۹۸۶ء کو انتقال ہو گیا۔ پھر ایک ماہ ۱۷ دن بعد ہی ہندوستان کے ممتاز صحافی جناب محمد مسلم صاحب مدیر دعوت دہلی، طویل علالت کے بعد ۳ جولائی ۱۹۸۶ء کو اپنے رب غفور سے جا ملے۔ پھر تین سال بعد ۱۴ نومبر ۱۹۸۹ء کو مدیر دعوت و الدعوۃ مولانا سلمان ندوی صاحب اپنی عظیم دینی خدمات کی زاد راہ لئے ہوئے رب کریم کی جناب میں حاضر ہو گئے اور اس کے ایک ماہ دس دن بعد ہی مختصر سی علالت کے بعد یکم جنوری ۱۹۹۰ء کو جماعت کے قیم اور ماہر تعلیم جناب افضل حسین صاحب ہم سب کو داغ مفارقت دے گئے اور پھر ایک سال بھی پورا نہ ہوا تھا کہ ۵ دسمبر ۱۹۹۰ء کو صرف پانچ دن کی نہایت مختصر علالت کے بعد، اعظم گڑھ کے ایک پرائیوٹ اسپتال

میں جماعت اسلامی ہند کے قائد اول محترم مولانا ابواللیث صاحب ندوی اصلاحی اپنے رب غفور و رحیم سے جا ملے۔ ۱۹۹۰ء کا عیسوی سال جماعت کی تاریخ کا ایک انتہائی المناک سال ثابت ہوا جب کہ جماعت کے دل و دماغ جناب افضل حسین صاحب اور مولانا ابواللیث صاحب ندوی اصلاحی۔ ہمیں اپنی جدائی کے غم میں تڑپتا چھوڑ گئے!

ویسے تو محترم مولانا ابواللیث صاحب ندوی اصلاحی سے میں ۱۹۵۳ء سے واقف تھا جب کہ ایلور ضلع مغربی گوداوری (آندھرا) میں انٹرمیڈیٹ کی تعلیم کے دوران مجھے جماعت اسلامی ہند سے قریب ہونے کا موقع ملا۔ البتہ اکتوبر ۱۹۸۲ء میں، جب کہ مولانا نے محترم کے طلب فرمانے پر جب میں دہلی منتقل ہوا تو مرحوم کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ ۱۹۸۲ء تا ۱۹۹۰ء تقریباً آٹھ سال، مولانا کی راست نگرانی میں تحریک کی خدمت کا ایک نادر موقع مجھے نصیب ہوا اور میں ان کی شفقت و محبت اور خاموش مگر موثر تربیت سے فیضیاب ہوا۔

دستور جماعت اسلامی ہند کی دفعہ ۲۳ (۲) کے تحت کسی کو امیر منتخب کرنے سے قبل یہ دیکھا جاتا ہے کہ وہ علم کتاب و سنت، تقویٰ، دینی بصیرت، امانت و دیانت، تدبر و اصابت رائے، عزم و حزم، معاملہ فہمی اور قوت فیصلہ، حلم و بردباری، تحریک اسلامی کی مزاج شناسی اور اس سے وابستگی، دستور جماعت کی پابندی، راہ خدا میں استقامت اور متعلقہ ذمہ داریوں کو انجام دینے کی صلاحیت کے لحاظ سے بحیثیت مجموعی جماعت میں سب سے بہتر ہو۔ اللہ تعالیٰ اپنے جن بندوں سے کوئی خاص خدمت لینا چاہتا ہے، انہیں کچھ مخصوص صلاحیتیں عطا فرماتا ہے خدا کا شکر ہے کہ تقسیم ہند کے بعد جماعت کی تشکیل جدید کے وقت سے اب تک ایسے افراد کی خدمات جماعت اسلامی ہند کو حاصل رہی ہیں، جو مندرجہ بالا اوصاف میں بعض مخصوص صفات کے حامل رہے ہیں اور جنہیں قدر اور رشک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ لیکن مذکورہ بالصدر اوصاف میں، میں نے مولانا ابواللیث صاحب ندوی اصلاحی مرحوم کو بحیثیت مجموعی سب سے بہتر پایا۔ یہی وجہ تھی کہ تقسیم ملک کے پرآشوب زمانہ میں مولانا جماعت اسلامی ہند کے امیر منتخب ہوئے اور اپریل ۱۹۴۸ء سے چوبیس سال تک برابر جماعت کے امیر

منتخب ہوتے رہے۔ اس کے بعد کی دو میقاتوں کے لئے جماعت نے محترم مولانا محمد یوسف صاحب مدظلہ کو اپنا امیر منتخب کیا لیکن اسکے بعد پھر ۱۹۸۱ء سے ۱۹۹۰ء کی دو میقاتوں کے لئے، مولانا کی کبر سنی اور مختلف عوارض و عذرات کے باوجود، مولانا ابواللیث صاحب ندوی اصلاحی کا انتخاب ہوا۔ مگر اس مدت میں مولانا کو اپنی صحت کے متاثر ہونے کا احساس شدید ہوتا گیا۔ چنانچہ میقات رواں جو اپریل ۱۹۹۰ء سے شروع ہوئی، کچھ تو تحریکی مصالح اور کچھ خود مولانا مرحوم کے شدید اصرار کے باعث ان کے عذرات قبول کر لئے گئے اور محترم جناب محمد سراج الحسن صاحب کو امیر جماعت منتخب کیا گیا۔ مولانا مرحوم ۱۱ر جولائی ۱۹۹۰ء کو امارت کا چارج حوالے کرکے اپنے وطن چاندپٹی (اعظم گڑھ) روانہ ہوگئے۔ وطن جانے سے قبل وہ رامپور تشریف لے گئے۔ مولانا محمد یوسف صاحب، جو جماعت کے سابق قیم اور امیر اور مولانا مرحوم کے قدیم ترین رفقاء میں سے ہیں، کی عیادت کی۔ مولانا عبدالسلام خاں صاحب وغیرہ اپنے مخلصین اور قدیم وجدید رفقائے رامپور سے بھی ملاقات کی اور یہی کلمات بار بار زبان مبارک پر آتے رہے کہ "کسے معلوم کہ شاید یہ ہماری آخری ملاقات ہو" میں دسمبر ۱۹۹۰ء کے پہلے ہفتہ میں بغرض علاج "سری اسپتال" حیدرآباد میں داخل تھا جہاں ۵ر دسمبر ۱۹۹۰ء کو مولانائے محترم کے انتقال کی المناک اطلاع ملی۔ کچھ دیر کے لئے مجھ پر سکتہ سا طاری ہوگیا۔ میں عجیب کشمکش میں مبتلا تھا کہ اپنے محسن و مربی کے آخری دیدار اور ان کے اس دار فانی سے آخری سفر میں مساعدت کی سعادت سے محروم ہوکر رہ گیا تھا۔ مولانا کے اکلوتے صاحبزادے، ابوسعید سلمہٗ کو اس دن جو تعزیتی خط میں نے لکھا تھا وہ میرے جذبات واحساسات کا ترجمان تھا۔[1]

آٹھ سال کی مختصر مدت میں، میں نے مولانا کی ذات گرامی سے اپنے لئے تربیت کی جو بیش بہا چیزیں پائیں ان میں اُن کی سادگی، متانت وسنجیدگی، فراست وذہانت، معاملہ فہمی، شخصیت کی پہچان اور مزاج شناسی، بے نفسی بے غرضی وبے باکی، ریا و نمود سے اجتناب، اپنے قدیم وجدید رفقاء سے قلبی تعلق یادداشت کی پختگی، صبر واستقامت

[1] فاضل مضمون نگار نے خط کی نقل منسلک کی تھی۔ جگہ کی تنگی کی وجہ سے وہ شامل اشاعت نہیں ہے (ادارہ)

اور احساس ذمہ داری بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ مولانا نے اپنی اولاد کی تربیت میں بھی غیر معمولی دلچسپی لی اور بچوں کو دینی رنگ میں رنگنے کے لئے انہوں نے اپنی جماعتی مصروفیات کے باوجود خاص توجہ فرمائی۔

۱۹۸۲،۸۴ء کے دوران مولانا مرحوم کے ساتھ پورے ملک کے تنظیمی دوروں میں، برطانیہ کے دعوتی دورے میں اور ۱۹۸۳ء کے دوران فریضۂ حج کی ادائیگی میں رفاقت کی سعادت مجھے نصیب رہی۔ یہ اوقات علم میں اضافہ اور سیرت وکردار سازی کے اعتبار سے میرے لئے اوقات زریں رہے ہیں۔ دوران سفر میں نے مولانا مرحوم کو اپنے آپ سے زیادہ میرے لئے فکرمند پایا۔

مرحوم علیہ الرحمۃ کی تحریریں اور تقریریں بے انتہا نپی تلی ہوتی تھیں۔ ایک ایک لفظ کافی غور وخوض کے ساتھ ادا ہوتا۔ کوئی بیان وغیرہ بغرض اشاعت تحریر کروانے کے بعد بھی اس کے جاری ہونے تک الفاظ یا جملوں میں ضروری ردوبدل فرمایا کرتے۔

ملت کے بعض مشترک فورم مثلاً آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت، وغیرہ کی موجودہ صورتحال سے مولانا مرحوم سخت تردد میں مبتلا تھے لیکن بار بار یہی فرمایا کرتے کہ "ہماری یہ خام خیالی ہوگی اگر ہم یوں فرض کر لیں کہ تحفظ ملت کے تعلق سے یہ ادارے مشترکہ اور تنہا کوئی ایک جماعت انجام دے پائے گی۔ ہم سب کو مل جل کر تعاون باہمی کی اسپرٹ کے ساتھ آگے بڑھنا ہوگا۔

مولانا مرحوم کے مخلصین ملک اور بیرون ملک میں بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں جو اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ مولانا نے اپنے منصب یا اپنے تعلقات کو اپنے کسی ذاتی مفاد کے لئے استعمال نہیں فرمایا جب وہ دنیا سے رخصت ہوئے ہیں تو آبائی جائداد کے علاوہ کوئی ورثہ انہوں نے نہیں چھوڑا۔

عبادت کے معاملہ میں اہتمام یہ تھا کہ ہر نماز باجماعت صف اول میں شریک ہوکر ادا فرماتے۔ رمضان المبارک میں اچھے حفاظ وقراء حضرات سے نماز تراویح کا اہتمام کرواتے۔ ذکر واذکار، توبہ واستغفار، قدم قدم پر اللہ تعالیٰ سے نصرت وہدایت کی

طلب، اہم امور میں نماز استخارہ کے ذریعہ اللہ سے رہنمائی اور رمضان کے مہینہ میں خصوصیت کے ساتھ تلاوت کی کثرت آپ کا معمول تھا۔ تقویٰ و پرہیزگاری، رزق حلال پر قناعت اور کفایت شعاری آپ کے اوصاف میں داخل تھے۔ دوسروں کو بھی قناعت اور کفایت شعاری نیز سادگی کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔

دینی تعلیم کی ترویج و اشاعت سے بھی مولانا مرحوم کو بے حد دلچسپی تھی۔ رامپور میں مرکزی درسگاہ اسلامی اور ثانوی درس گاہ قائم کی۔ یوپی دینی تعلیمی کونسل کے وہ رکن تھے۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اور جامعۃ الفلاح بلریا گنج کی مجالس انتظامیہ سے مولانائے محترم کی وابستگی رہی ہے بلکہ مدرسۃ الاصلاح وغیرہ میں جماعت کی امارت سے قبل تدریسی خدمات انجام دیتے رہے ہیں۔

مولانا ابواللیث صاحب ندوی اصلاحی کی شخصیت بڑی پروقار اور رعب و دبدبہ کی حامل تھی۔ ان کی بے انتہا سادگی کی وجہ سے نیا آنے والا جان نہیں پاتا کہ اس مجلس میں امیر جماعت کون ہیں۔ لیکن ایک بار جب آپ سے گفتگو اور تبادلہ خیال ہو جاتا تو پھر آپ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔ عام دنوں میں عصر کے بعد اور سردیوں میں دھوپ کے وقت اپنے دفتر کے سرصحن میں ان کی نشست بڑی سادہ لیکن پروقار ہوتی تھی۔ کبھی وہ تشریف نہ لاتے تو سونا سونا سا لگتا۔

مولانا کے عام رویہ میں معقول حدود کا لحاظ کرتے ہوئے بڑا توسع تھا۔ مختلف مسالک اور نظریات کے حامل ذمہ دار اور عام افراد کے ساتھ آپ کی ملاقاتوں میں کوئی تکلف نہ ہوتا۔ لوگوں کے جذبات کا بھی مولانا خاص لحاظ فرماتے۔ ایک مرتبہ میں نے انکے سامنے ایک تنظیمی مسئلہ پیش کیا۔ مولانا نے خلاف معمول اپنی سخت برہمی کا اظہار فرمایا، مگر چند گھنٹوں بعد وہ میرے کمرہ پر اس غرض سے تشریف لائے کہ شاید ان کی برہمی سے میرا ذہن متاثر ہوا ہو۔ سچ ہے کہ بڑوں کی بڑائی کی ایک پہچان یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے چھوٹوں کی ذرا سی بھی دل شکنی نہ ہونے دیں۔

مولانا وقت کے پابند اور وضعدار شخصیت کے حامل تھے دفتر کے اوقات،

ملاقاتوں، نمازوں، اجتماعات اور جلسوں کے مواقع پر جگہ جگہ میں نے دیکھا کہ مولانا پابندیٔ وقت کا غیر معمولی اہتمام فرماتے۔

مولانا کے انتقال کے بعد ان کے سلسلہ میں بعض غلط اور بے بنیاد تاثرات سامنے آئے ہیں مثلاً ایس آئی او آف انڈیا کی تشکیل کی بابت یہ درست ہے کہ یہ کل ہند طلبا تنظیم مولانا کے دور امارت میں تشکیل پذیر ہوئی لیکن اس سلسلہ کی ضروری کاروائی باضابطہ طور پر محترم مولانا محمد یوسف صاحب کے دور امارت میں ہو چکی تھی۔ ایس آئی ایم آف انڈیا اور طلبہ کی دوسری اسلامی تنظیموں کے طلباء، دونوں ہی جماعت اسلامی ہند کی باضابطہ سرپرستی کے خواہاں تھے مگر ایس آئی ایم کا اصرار تھا کہ سرپرستی کا اعلان تنظیم کے دستور میں نہیں، بلکہ پالیسی بیان وغیرہ میں ہو، جب کہ دوسری طلباء تنظیموں کا مشترکہ موقف یہ تھا کہ جماعت کی سرپرستی کا، کل ہند طلبا تنظیم کے مجوزہ دستور میں صراحت کے ساتھ اعلان کیا جا سکتا ہے۔ اس مسئلہ میں دونوں کے اختلاف سے جو صورت پیدا ہو گئی اس وجہ سے ایس آئی ایم (S.I.M) اس کل ہند طلبا تنظیم کا جز نہ بن سکی جو آگے چل کر ایس آئی او (S.I.O) کے نام سے تشکیل پذیر ہوئی۔ گفتگو و دنیا کے دوران جماعت کی مقرر کردہ کمیٹی کے ارکان کی جانب سے جماعت کی نمائندگی ہوتی رہی اور جماعت کی مرکزی مجلس شوریٰ نے جو خطوط متعین کیے تھے، ان کے پیش نظر ان طلبا تنظیموں کی کثرت رائے کے مطابق فیصلہ ہوا۔ اس پس منظر کو جانے بغیر ایس آئی او کی تشکیل کی بات کو مولانا مرحوم کے سر تھوپنا، آپ پر سراسر بہتان تراشی ہے۔

اسی طرح پارلیمانی الکشن میں ارکان جماعت کے ووٹ کے استعمال سے متعلق جو فیصلہ ہوا وہ بھی مرکزی مجلس شوریٰ کا فیصلہ تھا۔ اس کے طے ہونے میں مولانا مرحوم کا مثبت یا منفی کوئی رول ہی نہ تھا۔ لیکن افسوس کہ بعض حلقوں میں یہ غلط تاثر پیدا کیا گیا ہے کہ اس میں اصل ہاتھ تو مولانا مرحوم کا تھا۔ یہ بھی ان پر سراسر ایک اتہام ہے۔

مولانا ابواللیث صاحب ندوی اصلاحی کی شخصیت پیکر صبر و استقامت تھی۔

ذاتی، خاندانی، تحریکی، ملی وملکی۔ کتنے ہی مسائل سے آپ دوچار تھے بعض باتیں بڑی کرب انگیز ہوتیں۔ ان کے اکلوتے بیٹے ابوسعید سلمہ کی ادھر کچھ دنوں سے مزاج میں کچھ بے اعتدالی نے مرحوم کو سخت کرب میں مبتلا کر دیا تھا۔ گھریلو پریشانیوں کے علاوہ رفقائے تحریک بھی بعض اوقات مولانا پر بے جا الزام تراشی کرتے تھے۔ اپنوں اور پرایوں کی اس اذیت رسانی کو مولانا نے ہمیشہ خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کیا۔ اپنے معمولات میں ذرا بھی فرق نہ آنے دیا۔ حال یہ تھا کہ آپ کے قریب ترین ساتھی بھی آپکے اندرونی کرب کو جان نہیں پاتے تھے۔

مولانا مرحوم مسائل حاضرہ پر گہری نظر رکھتے تھے۔ مستقبل کے بارے میں ان کے اندازے بسا اوقات صحیح ثابت ہوتے۔ جب بھی کچھ کہتے یا لکھتے، ان کی باتیں بڑی فکر انگیز اور حکیمانہ ہوتی تھیں۔

مولانا ابواللیث صاحب کو بزرگان دین سے خاص تعلق خاطر تھا۔ کہیں سفر پر جاتے تو وہاں کی جو شخصیتیں دینی اعتبار سے ایک مقام رکھتی ہیں، ان سے ملاقاتیں کرتے رہتے اور اپنے روابط برقرار رکھنے کی کوشش فرماتے۔ متوفی بزرگوں کی قبور پر بھی حسب سہولت حاضری اور سلام کی آپ کوشش کرتے۔

مولانا مرحوم کی شخصیت کا ایک اور خاص پہلو، جس نے مجھے بے حد متاثر کیا، یہ تھا کہ آپ نے ہمیشہ اپنی شخصیت سے زیادہ جماعت کو ابھارا۔ ایک بار میں نے کہا کہ مولانا! حالات حاضرہ کے تقاضوں میں سے ایک تقاضا یہ سمجھا جاتا ہے کہ اگر کسی اچھے خطیب کے نام کا اعلان کیا جائے تو لوگ بڑی تعداد میں جمع ہوتے ہیں اور اس طرح زیادہ لوگوں تک حق بات پہنچانے کا موقع ملتا ہے۔ اس پر مولانا نے جواباً فرمایا:

"اگر ہمارے طرز عمل سے یہ بات معلوم اور عام ہو جائے کہ ہماری دعوت کسی شخصیت یا اشخاص کی طرف نہیں ہے تو وہ جماعت کے نصب العین، اقامت دین کو صاف ذہن سے سمجھنے لگیں گے اور اسلامی تحریک کے حقیقی قائد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا صحیح مقام صاف ستھرے انداز میں ان کے سامنے آجائے گا۔

ملت کے مشترک پلیٹ فارموں، مجلس مشاورت، پرسنل لا بورڈ، دینی تعلیمی کونسل وغیرہ۔ کے قیام میں جماعت کا جو رول رہا ہے اس سے عام طور پر لوگ واقف ہیں لیکن مولانائے محترم نے ہمیشہ ان فورموں میں جماعت کے پیچھے ہی رہنے کو پسند فرمایا۔ مرحوم کا یہ احساس تھا کہ خدمت دین کے معاملے میں آگے آکر نمایاں ہونے اور چھا جانے کی کوشش ذہن پر خراب اثرات ڈالتی اور نہایت مضرت رساں ثابت ہوتی ہے۔

مولانا مرحوم کے مزاج میں یہ بات رچی بسی تھی کہ دوسروں کی خدمات کا کریڈٹ خود لے لینا غلط اور ناپسندیدہ ہوتا ہے۔ اگر کوئی فرد مولانا کے سامنے کسی بات کا ذکر اس انداز سے کر دیتا کہ گویا وہ مولانا کو خراج تحسین پیش کر رہا ہے تو وہ فوراً فرما اٹھتے کہ "بھائی! کیا آپ کو معلوم نہیں، یہ تو ہمارے فلاں ساتھی کا کارنامہ ہے ان کے لئے دعائے خیر کیجئے"۔

مولانائے محترم اپنے اساتذہ اور تلامذہ کا بڑے خصوصی انداز میں تذکرہ فرمایا کرتے تھے۔ سنہ ۱۹۸۲ء میں مرکز منتقل ہونے سے قبل جب میں متحدہ عرب امارات کے دورہ پر جا رہا تھا تو اپنے استاد مولانا تقی الدین مراکشی کا خصوصی تذکرہ فرماتے ہوئے مجھ سے کہا اگر موقع ملے تو ان کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کا ہدیہ سلام پیش کروں اور دعاؤں کی درخواست کروں۔ اسی طرح مدینہ منورہ کے قاضی صاحب کی خدمت میں سلام کے ساتھ ایک تحفہ بھی میرے ذریعہ بھیجا۔

مولانا کے عزم و حزم کی سب سے بڑی مثال میرے نزدیک ان لمحات کی ہے کہ تقسیم ہند کے بعد، جب کہ مسلمانوں کے اچھے اچھے لیڈر ملک چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے تھے، کسی میں آتنا یارا نہ تھا کہ مسلمانوں کی خدمت کے لئے آگے بڑھے، کجا کہ کوئی تنظیم یا ادارہ قائم کرے اور چلائے، مولانا مرحوم نے اقامت دین کی داعی تحریک اسلامی کی قیادت کی نازک ترین ذمہ داری سنبھالی، گویا ایک کانٹوں بھرا تاج اپنے سر پر رکھا!

اس مختصر سے مقالہ میں بھلا مولانا مرحوم کے کن کن اوصاف حمیدہ کا ذکر خیر کیا جائے۔ سچ تو یہ ہے کہ بڑا وہ نہیں جو اپنے آپ کو بڑا ظاہر کرے بلکہ واقعتاً بڑا وہی ہے جسے واقف حال لوگ دل سے بڑا سمجھیں۔

بقیہ صفحہ ۱۱۹ پر